ماہنامہ

اشراق

لاہور

جولائی ۲۰۰۹

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

''ایمان کا ایک لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ لوگوں کو بھلائی کی تلقین کی جائے اور برائی سے روکا جائے۔ یہ تلقین کرنا اور روکنا، دونوں حکمت و موعظت کے ساتھ اور دعوت و نصیحت کے اسلوب میں ہونے چاہییں۔ لوگوں کی ہدایت اور گمراہی کا معاملہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ وہ اُن کو بھی جانتا ہے جو اُس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور اُن کو بھی جو ہدایت پانے والے ہیں، اِس لیے حق و انصاف کی دعوت کے لیے نہ کسی شخص کو داروغہ بننا چاہیے اور نہ اپنے مخاطبین کے لیے جنت اور جہنم کے فیصلے صادر کرنے چاہییں۔''

——— شذرات

المورد

دارالاشراق

ماہنامہ

اشراق

لاہور

جلد ۲۱ شمارہ ۷ جولائی ۲۰۰۹ رجب المرجب ۱۴۳۰ھ

فی شمارہ ۲۰ روپے
سالانہ ۲۰۰ روپے
زرتعاون بذریعہ منی آرڈر یا ڈرافٹ
بیرون ملک
۱۰۰۰ روپے
زرتعاون بذریعہ پوسٹل بیئرآرڈر یا ڈرافٹ

فہرست

المورد

51 کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ 54700۔ فون: 5865145, 5834306 (042)۔ فیکس 5864856 (042)
Web Site: www.ghamidi.org E-mail: ishraq@ghamidi:org

جاوید احمد غامدی

نہی عن المنکر

ایمان کا ایک لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ لوگوں کو بھلائی کی تلقین کی جائے اور برائی سے روکا جائے۔ یہ تلقین کرنا اور روکنا، دونوں حکمت و موعظت کے ساتھ اور دعوت و نصیحت کے اسلوب میں ہونے چاہییں۔ لوگوں کی ہدایت اور گمراہی کا معاملہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ وہ اُن کو بھی جانتا ہے جو اُس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور اُن کو بھی جو ہدایت پانے والے ہیں، اِس لیے حق و انصاف کی دعوت کے لیے نہ کسی شخص کو داروغہ بننا چاہیے اور نہ اپنے مخاطبین کے لیے جنت اور جہنم کے فیصلے صادر کرنے چاہییں۔ قرآن اِس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ داعی حق کی حیثیت سے خدا کے کسی پیغمبر کو بھی تذکیر و نصیحت اور بلاغ مبین سے آگے کسی اقدام کی اجازت نہیں دی گئی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّمَآ اَنۡتَ مُذَكِّرٌ، لَسۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِمُصَيۡطِرٍ.
(الغاشیہ ۸۸: ۲۱-۲۲)

”تم نصیحت کرنے والے ہو، تم اِن پر کوئی داروغہ نہیں ہو۔“

دائرۂ اختیار کا معاملہ، البتہ مختلف ہے۔ سن رشد کو پہنچنے کے بعد آدمی کسی عورت کا شوہر اور اِس کے نتیجے میں بچوں کا باپ بنتا ہے۔ بنی آدم کی یہ دونوں حیثیتیں دین و فطرت کی رو سے اُن کا ایک دائرۂ اختیار پیدا کرتی ہیں۔ یہی صورت اداروں اور حکومتوں کی ہے۔ یہ جب قائم ہو جاتی ہیں تو اِن کے سربراہوں کے لیے بھی ایک دائرۂ اختیار پیدا ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی دائرے کے اندر ہونے والی برائیوں کے بارے میں فرمایا ہے:

من رأى منكم منكرًا فليغيره بيده، فان لم يستطع فبلسانه، فان لم يستطع فبقلبه،

”تم میں سے کوئی شخص برائی دیکھے تو اُسے چاہیے کہ ہاتھ سے اُس کا ازالہ کرے۔ پھر اگر اِس کی ہمت نہ

و ذلك اضعف الایمان. (مسلم، رقم ۱۷۷)　　ہو تو زبان سے اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو دل سے اُسے ناگوار سمجھے اور یہ ایمان کا ادنیٰ ترین درجہ ہے۔‘‘

برائی کے لیے اِس روایت میں ’منکر‘ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اِس سے مراد وہ برائیاں نہیں ہیں جو خالص مذہبی احکام کی خلاف ورزی سے پیدا ہوتی ہیں، بلکہ وہ برائیاں ہیں جنھیں پوری انسانیت بلا امتیاز مذہب وملت برائی سمجھتی ہے۔ چوری، جھوٹ، بد دیانتی، غبن، خیانت، ناپ تول میں کمی، ملاوٹ، حق تلفی، فواحش، جان، مال اور آبرو کے خلاف زیادتی اور اِس نوعیت کی دوسری برائیوں کو عربی زبان میں لفظ ’منکر‘ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اِنھی برائیوں سے متعلق ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جو حکم قرآن میں بیان ہوا ہے، یہ اُسی کی فرع ہے۔ آپ نے تنبیہ فرمائی ہے کہ اِن برائیوں کو اپنے اپنے دائرۂ اختیار میں دل سے بھی برا نہیں سمجھو گے تو اِس سے آگے پھر ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔

’ان لم یستطع‘ کے جو الفاظ اِس روایت میں آئے ہیں، اُن کو بھی سمجھ لینا چاہیے۔ اُن سے مراد وہ استطاعت نہیں ہے جو آدمی کو کسی چیز کا مکلّف ٹھیراتی ہے، اِس لیے کہ اُس کے نہ ہونے سے وہ اگر کسی حکم پر عمل نہیں کرتا تو ایمان کے کسی نچلے درجے میں نہیں آجاتا۔ روایت میں یہ الفاظ ہمت اور حوصلے کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں جو ایمان کی قوت اور کمزوری سے کم یا زیادہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہ صرف دائرۂ اختیار ہے جس میں کوئی شخص اگر برائی کو ہاتھ سے نہیں روکتا تو اُس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایمان کے پہلے درجے پر نہیں رہا، اِس لیے کہ اختیار واقتدار کے باوجود اُس نے برائی کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اِس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ ایمان کے اِس درجے کو پانے کے لیے لوگ اپنے پیرووں کے جتھے منظّم کریں اور ازالۂ منکر کی غرض سے نکل کھڑے ہوں۔ اِس طرح کا اقدام اگر کیا جاتا ہے تو یہ بدترین فساد ہو گا جس کی دین میں کوئی گنجایش نہیں ہے۔ دین کے تمام احکام انسان کے اختیار اور اُس کی استطاعت کے لحاظ سے دیے گئے ہیں۔ ’لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا‘* ایک قطعی اصول ہے جو دین وشریعت کے سارے احکام میں ملحوظ ہے۔ نہی عن المنکر کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو اِسی اصول کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔

خورشید احمد ندیم

دین اور ریاست

دین اور ریاست کا باہمی تعلق آج ایک بار پھر مسلمان معاشروں میں زیر بحث ہے۔ بیسویں صدی میں یہ مسئلہ اس وقت ایک اہم سوال کے طور پر سامنے آیا جب نو آبادیاتی دور کے خاتمے پر مسلم معاشرے کسی شناخت کی تلاش میں تھے۔ اس وقت دین اور ریاست کا یہ تعلق زیادہ تر ایک نظری بحث کا عنوان تھا۔ آج پچاس ساٹھ سال بعد جب یہ سوال اُٹھایا جاتا ہے کہ مذہب کا ریاست سے کیا تعلق ہے تو اس کے پس منظر میں وہ تجربات بھی ہمارے سامنے ہیں جو ہم نے ان برسوں میں، اس تعلق کو ایک عملی روپ دینے کے لیے کیے۔ اس طرح آج یہ نظری سے زیادہ ایک عملی اور اطلاقی سوال ہے۔ نظری بحث میں یہ آسانی ہوتی ہے کہ عقلی اور نقلی دلائل کا غلبہ رہتا ہے۔ عقل و منطق کی اساس پر من پسند اور دیدہ زیب عمارتیں تعمیر کی جاسکتی ہیں اور تاریخی واقعات کی ہمیشہ ایک سے زیادہ تعبیرات ممکن ہوتی ہیں۔ مشکل وہاں ہوتی ہے جہاں لمحہ موجود میں ایک مسئلہ اپنی ہمہ گیریت کے ساتھ نظروں کے سامنے کھڑا ہوتا اور ہم سے حل کا طلب گار ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں زمینی حقائق کو نظر انداز کر کے بحث کو نظری دائرے میں قید کرنا آسان نہیں ہوتا۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ دین اور ریاست کا تعلق اب نظری سے زیادہ ایک عملی سوال ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ آج افغانستان، عراق، ایران اور پاکستان سمیت مختلف مسلم ریاستوں میں مسلمان جس صورت حال سے دوچار ہیں، اس کے پس منظر میں مذہب اور ریاست کے باہمی تعلق ہی کو قائم رکھنے کی مختلف کوششیں کارفرما ہیں۔ اس لیے اس مسئلے کو اطلاقی حوالے سے زیر بحث لائے بغیر ہم درپیش حالات کا ادراک کر سکتے ہیں نہ تدارک۔ ریاستی نظام اصلاً غیر مذہبی اور تمدنی معاملہ ہے۔ کسی خطے میں آباد ایک گروہ، کسی مذہب کو مانتا ہے یا نہیں، اس سے قطع نظر وہ اس تمدنی ضرورت کو ضرور مانتا ہے کہ اسے کسی اجتماعیت کی صورت میں منظّم ہونا چاہیے۔ گویا ریاست کا وجود انسان کی ایسی تمدنی ضرورت ہے جس سے تاریخ کے کسی دور میں انسان کے کسی عملی انحراف کا ثبوت موجود نہیں ہے۔ انارکسٹ معاشرہ ایک خیالی ریاست (utopia) ہے، جو تاریخِ انسانی میں کبھی وجود میں نہیں آسکا۔

اس ناگزیر نظم اجتماعی یا ریاستی نظام کی اب تک تین صورتیں ہی رائج رہی ہیں: ایک شخصی یا خاندانی بادشاہت۔ اس میں حکمرانی کا حق کسی ایک فرد یا خاندان کو حاصل ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکمران قانون ساز ہے اور اس کو یہ طے کرنا ہے کہ اجتماعی نظام کس قانون اور ضابطے کے تحت چلنا ہے۔ اس کا یہ حق کسی عدالت اور پارلیمان میں چیلنج نہیں ہوسکتا۔ وہ اپنی ذات میں عدالت ہے اور پارلیمان بھی۔ قدیم ریاستوں اور آج کے بعض ممالک میں رائج بادشاہتیں اسی کی ایک صورت ہیں۔

ایک شکل وہ ہے جس میں ایک گروہ کسی الہامی (Divine) استحقاق یا طاقت کی بنیاد پر اقتدار پر قبضہ کرتا ہے۔ پاپائیت میں مذہبی طبقہ اقتدار کو اپنا الہامی حق قرار دیتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ مشیت الٰہی سے حکومت کر رہا ہے اور اس کا فرمایا ہوا گویا قانون خداوندی ہے۔ اسی طرح فوج کسی ملک میں اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد موجود آئین و دستور کو معطل کر دیتی ہے اور اس کے بعد فوجی اعیان کا دیا ہوا قانون نافذ ہو جاتا ہے۔ پاپائیت میں مذہبی طبقہ حکمران اور قانون ساز ہوتا ہے اور فوجی آمریت میں فوجی قیادت۔ اشتراکی ریاستوں میں کمیونسٹ پارٹی کی آمریت ہوتی ہے۔

تیسری صورت جمہوریت ہے۔ اس میں حقِ حکمرانی کی نسبت عوام سے ہے۔ عوام کسی فرد یا گروہ کو یہ حق تفویض کرتے ہیں کہ وہ ان کی مرضی سے منصب اقتدار پر فائز ہوں۔ جب نصب کا حق عوام کا ہے تو عزل کا حق بھی عوام کے پاس ہوتا ہے۔ وہ اگر چاہیں تو ایک حکمران کو اقتدار سے ہٹا کر کسی دوسرے کو بٹھا دیں۔ اس صورت میں قانون سازی عوام کے منتخب نمائندوں کا حق سمجھی جاتی ہے۔

انسانی تاریخ میں نظم حکومت کی کوئی چوتھی صورت دریافت نہیں ہوسکی۔ بطور ایک مسلمان معاشرہ ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ اسلام ریاست اور نظم حکومت کے مسئلے کو کس نظر سے دیکھتا ہے اور کیا وہ اس مقصد کے لیے مذکورہ صورتوں سے مختلف کوئی صورت بھی تجویز کرتا ہے؟

ریاست یا اس کی تشکیل، ان مسائل میں سے نہیں ہے جسے اسلام نے فی نفسہ موضوع بنایا ہے۔ اسلام کا معاملہ فی الجملہ یہ ہے کہ وہ انسان کی ناگزیر تمدنی ضروریات کو کبھی زیر بحث نہیں لاتا۔ وہ انھیں ایک امر واقعہ کے طور پر قبول کرتا اور بالعموم انسان کے عقل و فہم پر اعتماد کرتا ہے۔ ریاست اور نظم اجتماعی کے باب میں اسلام کی مداخلت دیگر شعبہ ہائے حیات کی طرح اصولی اور اخلاقی ہے۔ اس میں ایک طرف وہ انسان کی تمدنی ضرورت کو مؤکد کرتا اور دوسری طرف یہ چاہتا ہے کہ جو بھی نظم اجتماعی وجود میں آئے، اس کا تزکیہ کیا جائے اور وہ انسان کی اخلاقی زندگی میں کوئی

فساد برپا نہ کرے۔ چنانچہ اگر ہمیں رسالت مآب ﷺ کے بعض ارشادات ملتے ہیں جو ''الجماعۃ'' یا ''سلطان'' سے وابستہ رہنے کی تاکید کرتے ہیں تو یہ تعلیم انسان کی تمدنی ضرورت کے عین مطابق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب مسلمانوں کا ایک نظمِ اجتماعی موجود ہے تو پھر اس ہی کے ساتھ وابستہ رہنا چاہیے اور یہ کہ اگر اخلاقی اعتبار سے اس میں خرابی در آئی ہے تو اس کی اصلاح کیسے کی جائے گی۔ دوسری طرف وہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ نظمِ اجتماعی سے متعلق کچھ امور ایسے ہیں جن کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے کر دیا ہے۔ اب اگر مسلمان اپنی اجتماعیت کی تعمیر کرتے ہیں تو لازم ہے کہ وہ ان امور میں اللہ اور رسول ﷺ ہی کو حاکم مانیں۔ سیاسی نظم کے حوالے سے اسلام کا ایک اہم حکم یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے باہمی مشورے ہی سے قائم ہوگا (الشوریٰ ۴۲: ۳۸)۔ اسلام نے ریاست یا نظمِ اجتماعی کے باب میں اسی نوعیت کی چند تعلیمات دی ہیں۔

اس مقدمے کی روشنی میں یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ نظمِ حکومت کی مروجہ صورتوں میں واحد صورت جمہوریت ہی ہے جسے ایک مسلمان معاشرے میں اختیار کیا جانا چاہیے۔ وہ کسی فرد کا یہ حق تسلیم نہیں کرتا کہ چونکہ اس کا باپ حکمران تھا، اس لیے اسے بھی حکمران مانا جائے۔ وہ کسی فرد یا گروہ کو بھی یہ حق نہیں دیتا کہ وہ بندوق کے زور پر حکمران بن جائے یا اپنے حقِ حکمرانی کے لیے کوئی الہامی دلیل پیش کرے۔ اب اس فرد یا گروہ کو حکمرانی کا حق حاصل ہے جس پر عامۃ الناس بحیثیت مجموعی اعتماد کرتے ہوں۔

حکومتِ اسلامی یا اسلامی ریاست کے باب میں ہمارے مذہبی لٹریچر میں جو افکار موجود ہیں، ان میں سے بیش تر کا تعلق عباسی دور کے حالات سے ہے۔ اس عہد میں ریاست کو جن مسائل کا سامنا تھا یا اس عہد کے جو سیاسی مطالبات تھے، ان کو سامنے رکھتے ہوئے بعض اصطلاحیں وضع ہوئیں اور بعض خیالات پیش کیے گئے۔ ماوردی، بغدادی، امام غزالی اور دوسرے اہلِ علم نے اس حوالے جو کچھ لکھا ہے، اس کی نوعیت یہی ہے۔ ان میں بڑی حد تک عباسی حکومت کے اقدامات کے لیے جواز تلاش کیے گئے۔ یہ بات اہم ہے کہ نظامِ حکومت کے باب میں اسلام کا جو سب سے اہم مطالبہ تھا، وہ ان صاحبانِ علم کے ہاں اس اصرار کے ساتھ زیرِ بحث ہی نہیں آیا۔ وہ مطالبہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے معاملات چونکہ مشاورت سے چلتے ہیں لہٰذا اسی بنیاد پر کسی کا حقِ اقتدار ثابت ہوسکتا ہے۔ اس عہد کے لٹریچر میں موروثی بادشاہت کو یا تو موضوع نہیں بنایا گیا یا پھر اس کے لیے جواز تلاش کیا گیا۔ اس بنا پر اگر ہم نے آج کے سیاسی حالات میں کوئی نقطۂ نظر اختیار کرنا ہے تو یہ لٹریچر شاید ہماری زیادہ مدد نہ کر سکے۔ تاہم یہ اس لحاظ سے راہنما ہوسکتا ہے کہ اپنے عہد کے سیاسی حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہمارے اسلاف نے کس طرح دینی احکام کو سمجھا۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ نظام حکومت کی واحد صورت جو اسلام کے مزاج سے ہم آہنگ اور اس کی تعلیمات کے عین مطابق ہے، وہ جمہوریت ہے تو اس پر بعض اعتراضات عموماً پیش کیے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ چونکہ عوام دین سے واقف نہیں ہیں، اس لیے وہ ایسے لوگوں کو پارلیمان میں بھیجتے ہیں جو دین سمجھتے ہیں نہ دینی اعتبار سے مثالی اخلاق و کردار کے مالک ہوتے ہیں۔ اس بنیاد پر ہمارے ہاں دینی جماعتیں بالعموم مسلمانوں کی منتخب حکومتوں اور بڑی سیاسی جماعتوں کو لادینی قرار دیتی ہیں۔ اسی طرح وہ اپنے فہمِ دین کے مطابق حکومت سے بعض مطالبات کرتی ہیں جسے وہ نفاذِ شریعت کا مطالبہ قرار دیتی ہیں۔ یہ مطالبہ عام طور پر کسی عوامی تحریک کے نتیجے میں سامنے نہیں آتا بلکہ وہ مذہبی جماعتیں اسے پیش کرتی رہی ہیں جنھیں عوامی سطح پر سوادِ اعظم کی کبھی حمایت حاصل نہیں رہی۔ اس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ کسی فوجی آمر نے اپنی مصلحت کے تحت یا پھر کسی سیاسی حکومت نے اپنی سیاسی ضروریات کے پیش نظر ایسے اقدامات کیے جن کا مقصد نفاذ شریعت کے اس مطالبے کو پورا کرنا تھا۔ جیسے جنرل ضیاء الحق صاحب کے دور میں حدود آرڈیننس کا نفاذ یا ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے عہد میں شراب وغیرہ پر پابندی ہے۔ ان اقدامات کے بارے میں ہم یہ بات اطمینان کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان سے معاشرے کی اسلامی تعمیر کے حوالے سے قابلِ ذکر پیش رفت نہیں ہو سکی۔ اس صورتِ حال کو سامنے رکھیے تو دو سوال پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ اگر عامۃ الناس کا فہم دین کسی کے نزدیک قابل اعتبار نہیں تو کیا پھر بھی جمہوریت ہی کو اختیار کیا جانا چاہیے؟

۲۔ اگر محض قوانین کے نفاذ سے مطلوبہ تبدیلی نہ آسکے تو کیا اس کے لیے کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا جانا چاہیے؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے تو ہمارے نزدیک اس صورت میں بھی جمہوریت کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ موجود نہیں ہے۔ یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ جس حد تک عامۃ الناس کے لیے دین ایک سنجیدہ مسئلہ ہوگا، اسی نسبت سے اقتدار کے ایوانوں میں دین کے حوالے سے سنجیدگی پائی جائے گی۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ معاشرے کا عمومی مزاج غیر دینی ہو اور منصبِ اقتدار پر تشریف فرما لوگ خلافتِ راشدہ کی مثال پیش کر رہے ہوں۔ اگر اسلام میں کسی اقتدار کے جواز کے لیے مشاورت دینی ضرورت ہے تو پھر عوام کا انتخاب ان کے فہمِ دین یا دین کے حوالے سے ان کے عمومی ادراک سے مختلف کیسے ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں راستہ یہ نہیں ہے کہ رائے عامہ کی تائید کے اصول کو نظر انداز کر کے کسی دوسرے ذریعے سے صالحین کی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر بالفرض کسی جگہ یہ انہونی ہو جائے کہ ایک بہت صالح جماعت یا فرد کسی حادثے کے سبب اقتدار کے ایوانوں تک پہنچ جائے تو بھی اس سے معاشرے میں مطلوبہ تبدیلی نہیں آسکتی۔ ہماری تاریخ میں حضرت عمر بن عبد العزیز کی حکومت بھی ایسا ہی ایک استثنائی

واقعہ تھا۔ شخصی حوالے سے انھوں نے خلفاے راشدین کی مثال قائم کر دی، لیکن مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا تجزیہ ہے کہ وہ بھی اس ''مجددِ کامل'' کے منصب تک نہیں پہنچ سکے، جو معاشرے کی اسلامی تشکیل کے لیے ایک ناگزیر ضرورت ہے (تجدید واحیائے دین)۔ یہ واقعہ اس دعوے کی دلیل ہے کہ معاشرے کی اسلامی تشکیل کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ صالحین کو اقتدار کے ایوانوں تک پہنچایا جائے۔ اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ معاشرے کی تعلیم و تربیت اس ڈھنگ سے کی جائے کہ اس کا عمومی مزاج صالح ہو جائے۔ اس کے بعد اس کے مشورے سے جو حکومت قائم ہو گی، وہ لازماً صالحین کی ہو گی۔

ہماری مذہبی جماعتوں نے معاشرے کی اسلامی تشکیل کے لیے ساری توانائیاں اس پر صرف کر ڈالیں کہ وہ صالحین کو اقتدار کے ایوانوں تک پہنچائیں۔ اب ضرورت ہے کہ وہ اس نقطۂ نظر کی اصلاح کریں جس کی غلطی تجربے نے واضح کر دی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ریاست کے بجاے معاشرہ ان کی دلچسپی کا اصل میدان بنے۔ اس کی واحد صورت معاشرے کی تعلیم ہے۔ مغرب میں ہم آج جس سیاسی نظم کو دیکھتے ہیں وہ اصلاً ان معاشرتی اقدار کا پرتو ہے جنھیں وہاں فروغ ملا۔ جب جمہوریت ایک معاشرتی قدر بنی اور لوگوں نے ایک دوسرے کے حقِ اختلاف کو سماجی سطح پر قبول کیا تو اس کا اظہار ان کے نظام حکومت میں بھی ہوا۔ اسی طرح جب معاشرتی سطح پر مذہب کے ایک محدود کردار پر بالعموم اتفاق رائے پیدا ہو گیا تو اس کے بعد اس کا ظہور حکومتی پالیسیوں میں بھی ہوا اور آج مغرب کا سیاسی نظام پوری طرح ان اقدار سے ہم آہنگ ہے جن پر معاشرہ اتفاقِ رائے سے کھڑا ہے۔ ہمارے سامنے بھی یہی راستہ ہے۔ اگر ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ ہماری نجی اور اجتماعی زندگی میں دینی مزاج کا اظہار ہو تو یہ کام اسی وقت ہو سکے گا جب معاشرہ اس کو بطور قدر اختیار کرے گا۔ اس کے بعد یہ ممکن نہیں ہے کہ جمہوریت کی صورت میں معاشرہ کسی اور قدر کا نمائندہ ہو اور پارلیمنٹ کسی دوسری قدر کو فروغ دے رہی ہو۔ اس ترتیب کو الٹنے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم سماجی سطح پر ایک منافقت کو فروغ دیں اور اسے ایک سماجی قدر کی حیثیت سے قبول کیے رکھیں۔

جب یہ طے ہے کہ مقصود معاشرے کی اسلامی تشکیل ہے اور یہ اقتدار پر صالحین کے قبضے سے ممکن نہیں ہے تو پھر جمہوریت کی نفی کے بجاے سارا زور معاشرے کی تعلیم و تربیت پر صرف کیا جائے۔ اس سے دین و ریاست کے مابین ایک فطری تعلق وجود میں آئے گا جو دیرپا ہو گا۔

دین و ریاست کے باب میں جب ہم عصری تجربات اور افکار کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مذہبی اہل سیاست کے نزدیک اسلامی ریاست کا جو تصور ہے، اس سے مراد اقتدار کا ایک مخصوص طبقے کو منتقل

ہونا ہے۔ ایران میں علما اور افغانستان میں طالبان کی حکومتیں اس کی مثال ہیں۔ ہماری مذہبی سیاسی جماعتیں بھی اسی نقشے کو سامنے رکھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ یہ سرحد میں متحدہ مجلسِ عمل کے عہد میں پیش کیا جانے والا حسبہ بل ہو یا سوات کا نظامِ عدل ریگولیشن ۲۰۰۹ء ہو، ان کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک نفاذ شریعت سے مراد یہی ہے کہ ملک میں ایک خاص طرز کا عدالتی نظام ہو اور اس کی باگ ڈور علما کے ہاتھ میں ہو۔ یہ اندازِ فکر ایک طرح سے عدلیہ کی آمریت پر مبنی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا حاصل علما کی آمریت ہے کیونکہ اس نظام میں قاضی کا عہدہ علما ہی کے پاس ہوگا۔ اسی کو پاپائیت کہتے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ تاریخ نے اس تصوّر کو مسترد کر دیا ہے، یہ اس نظامِ ریاست سے بھی ہم آہنگ نہیں ہے جس نے تقسیم کار کے اصول پر کئی ریاستی اداروں کو جنم دیا ہے اور جو انسان کی اجتماعی بصیرت کے اظہار کا مؤثر ترین اور معقول ترین ذریعہ ہے۔

اس تجزیے کا حاصل یہ ہے کہ دورِ جدید میں اگر ہم نے دین و ریاست کے باہمی تعلق کو قائم رکھنا ہے تو اس کے لیے وہ افکار ہماری مدد نہیں کر سکتے جو بنوعباس کے عہد خلافت یا پھر بیسویں صدی میں بعض اہل علم کی طرف سے پیش کیے گئے۔ اس کے لیے ایک نئے نظام فکر new paradigm ضرورت ہے۔ اس کے خط و خال ہمارے نزدیک یہ ہے:

۱۔ اس معاملے میں مکمل یک سوئی کی ضرورت ہے کہ ہمارے لیے اگر کوئی نظامِ سیاست وحکومت قابل قبول ہے تو وہ صرف جمہوریت ہے۔ لہٰذا میدانِ سیاست میں ہونے والی جدوجہد محض اس نکتے پر مرتکز ہونی چاہیے کہ اوّل و آخر جمہوری ریاست ہمارا مقصد ہے۔

۲۔ اگر ہم ریاست کو کوئی مخصوص نظری شناخت دینا چاہتے ہیں تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ ہم عوام کو اس کے لیے قائل کریں۔ اس کا واحد راستہ معاشرے کی تعلیم و تربیت ہے۔ جس کے لیے ریاست کے آئین اور قانون کے مطابق ابلاغ کے تمام ذرائع استعمال میں لائے جا سکتے ہیں۔

۳۔ ۱۹۷۳ء کے آئین میں اسلام کو ریاست کا مذہب قرار دینے اور قرآن وسنت کی تعلیمات کے برخلاف قانون سازی کے ممنوع ہونے کے بعد، سیاسی جماعتوں میں مذہبی اور غیر مذہبی کی تقسیم بے معنی اور غیر ضروری ہے۔ اب سیاسی جماعتوں کو اس طرح اپنے منشور کی بنیاد پر سیاست کرنی چاہیے جس طرح جمہوری معاشروں میں کی جاتی ہے۔

۴۔ نظامِ تعلیم میں مذہبی اور غیر مذہبی کی تقسیم بھی بے معنی ہے جس کا نتیجہ نظریاتی ابہام ہے، اس لیے اسے ختم ہونا

چاہیے۔

ہمارے نزدیک اس کی جو ممکنہ عملی صورت ہے، اسے ہم ایک الگ مضمون میں بیان کریں گے۔

ڈاکٹر مفتی سرفراز احمد نعیمی کی شہادت

جامعہ نعیمیہ کے مہتمم، ممتاز عالمِ دین ڈاکٹر مفتی سرفراز احمد نعیمی کا قتل، ایک ایسی دل گیر خبر تھی جس نے ہر صاحب دل کو رنجیدہ کر دیا۔ ان کا تعلق بریلوی مکتبِ فکر سے تھا لیکن ان کے غم کو مسلکی وابستگی سے ماورا ہو کر محسوس کیا گیا۔ یہ ان کے اس طرزِ عمل کا نتیجہ ہے جسے انھوں نے فقہی و گروہی اختلافات میں بالعموم اختیار کیے رکھا۔ اس معاملے میں وہ صحیح معنوں میں اپنے والد مولانا مفتی محمد حسین نعیمی مرحوم کے جانشین تھے جن کی وسعتِ قلبی، اختلاف کے باب میں، ہمارے اسلاف کی روایت کا تسلسل تھی۔ مفتی سرفراز نعیمی صاحب علما کی ہر اس مجلس کا حصہ رہے جو کسی قومی یا ملی مسئلے پر غیر فرقہ دارانہ بنیاد پر وجود میں آئی۔ ان کی طبعی سادگی اور اخلاص کا بھی انھیں ہر دل عزیز بنانے میں ایک کردار تھا۔ ان کی شہادت نے اس قومی المیے کو ایک بار پھر پوری شدت کے ساتھ واضح کیا ہے کہ دینی مسائل میں فہم کے اختلاف کے معاملے میں تشدد ہمارے ہاں اس سطح تک سرایت کر چکا ہے کہ بعض گروہوں نے قتل جیسے جرم کو بھی اس باب میں روا رکھا ہے جس کی سزا قرآن مجید نے دائمی جہنم بیان کی ہے۔ بلا شبہ دین میں تحریف کی اس سے بد ترین صورت ممکن نہیں۔ نصوص کے فہم اور ان سے استنباطِ احکام کے معاملے میں اختلاف ہماری تاریخ کے صدرِ اول سے جاری ہے اور اہلِ علم نے اسے کبھی ممنوع نہیں کہا۔ یہ اختلاف کس نوعیت کا رہا ہے، اس کا اندازہ حضرت ربیعہ بن عبد الرحمٰن مدنی کے ایک قول سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ مدینہ کے ایک جید عالم اور امام مالک کے شیوخ میں سے تھے۔ انھیں عباسی خلیفہ عباس نے عراق میں اپنا مشیر بنایا۔ انھوں نے کچھ دن عراق میں گزارے اور واپس مدینہ آ گئے۔ اہلِ مدینہ نے ان سے پوچھا کہ انھوں نے اہلِ عراق کو کیسا پایا تو ان کا کہنا تھا: "جو ہمارے ہاں حلال ہے وہ ان کے نزدیک حرام ہے اور جسے ہم حرام کہتے ہیں وہ اسے حلال سمجھتے ہیں"۔ ان سے یہ قول بھی منسوب ہے: "معلوم

ہوتا ہے ہمارے ہاں اوران کے ہاں اور نبی مبعوث ہوئے ہیں"۔(ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی،ادب الاختلاف فی الاسلام)۔اس سے اہل مدینہ اوراہلِ عراق کے مابین فہمِ دین کے اختلاف کی شدت کوسمجھا جا سکتا ہے۔اس کے باوجودامت دونوں گروہوں کا احترام کرتی اوران کی عظمت کی معترف ہے۔ہماری بدقسمتی یہ رہی کہ ہم اسلاف کی فقہی آراء کے مقلدتو بنے،لیکن اختلاف کے باب میں ان کے رویے کی تقلید نہ کرسکے۔ڈاکٹرسرفرازنعیمی جیسے لوگوں کے ساتھ یہ سلوک ہمیں متوجہ کررہا کہ ہمارے اہلِ علم کوصرف اس مقصد کے لیے ایک اتحاد بنانا چاہیے کہ وہ ہراس گروہ سے قطع تعلق کریں گے جواس نوعیت کے اختلافات میں تشدد کا قائل ہےاوراسے معاشرتی سطح پرکبھی گوارانہیں کریں گے۔ہم اپنا نقطہءنظرلوگوں کے سامنے رکھ دیں گے۔اب یہ ان کا کام ہے کہ وہ کس رائے کوقبول کرتے ہیں۔اُمّت کے اجتماعی ضمیر نے آراء کے ردوقبول میں پہلے کوئی غلطی کی ہے نہ آیندہ کرے گی۔حکومت کے لیے شاید یہ ممکن نہ ہوکہ وہ ہرعالمِ دین کوحفاظتی حصارفراہم کرسکے۔یہ اہتمام علما کوخودہی کرنا ہوگا۔

یہ حادثہ ہمیں اس جانب بھی متوجہ کررہاہے کہ جب ہم نے (اسلاف کی رائے کے برخلاف) دورِحاضر میں نجی جہادکوجائزقراردے دیا تواس کے بعدایسے گروہوں کا پیدا ہونا ناگزیر ہے جوفہمِ دین کے اختلاف کو جہادقراردیں اور پھر "دشمنوں" کو تہ تیغ کرنا شروع کردیں۔اب ان کا دشمن وہی ہوگا جوان سے اختلاف کررہاہے۔جب ہم نے ان کا حقِ جہادقبول کرلیا توہدف کے تعین کے باب میں ان کے حق کی نفی کیسے کرسکتے ہیں؟ ہمارے نزدیک یہ مسئلہ اس وقت علما کی توجہ کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔اس کونظرانداز کرنے کا مطلب ڈاکٹرمفتی سرفرازنعیمی جیسے افراد کے قتل کو روارکھنا ہے۔ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کواپنی مغفرت سے نوازے اورمسلمان معاشروں کوفساد سے محفوظ رکھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ المائدہ

(۱۴)

(گذشتہ سے پیوستہ)

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، لَا تَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ، بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ، وَمَنْ یَّتَوَلَّھُمْ مِّنْکُمْ فَاِنَّہٗ مِنْھُمْ، اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۵۱﴾ فَتَرَی الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ یُّسَارِعُوْنَ فِیْھِمْ، یَقُوْلُوْنَ: نَخْشٰٓی اَنْ تُصِیْبَنَا

ایمان والو، تم اِن یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔[۱۲۸] یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں[۱۲۹]، اور (یاد رکھو کہ) تم میں سے اگر کوئی (اِس تنبیہ کے باوجود) اِنھیں اپنا دوست بناتا ہے تو اُس کا شمار پھر اِنھی میں ہے۔ اللہ اِس طرح کے ظالموں کو کبھی راہ نہیں دکھاتا۔[۱۳۰] چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ جن کے دلوں میں (نفاق کی) بیماری ہے، وہ اِن سے پینگیں بڑھا رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ کسی مصیبت میں نہ پھنس

۱۲۸؎ آگے کی آیتوں سے واضح ہے کہ خطاب اگرچہ عام ہے، لیکن روے سخن اُنھی منافقین کی طرف ہے جو یہود کے زیر اثر تھے اور جن کا ذکر اوپر آیت ۴۱ میں 'اَلَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْکُفْرِ' کے الفاظ میں ہوا ہے۔ اِنھیں موالات سے منع اِس لیے کیا گیا ہے کہ پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اللہ کا فیصلہ اب اِن یہود و نصاریٰ کے بارے میں صادر ہونے والا تھا، جس سے پہلے ضروری تھا کہ منکرین، منافقین اور سچے اہل ایمان کو الگ الگ کر دیا جائے۔ اِس زمانے کے یہود و نصاریٰ سے اِس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

دَآئِرَۃٌ، فَعَسَی اللّٰہُ اَنْ یَّاْتِیَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِہٖ فَیُصْبِحُوْا عَلٰی مَآ اَسَرُّوْا
فِیْٓ اَنْفُسِہِمْ نٰدِمِیْنَ﴿۵۲﴾ وَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا: اَھٰٓؤُلَآءِ الَّذِیْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰہِ

جائیں[۱۳۱]۔ سو بہت ممکن ہے[۱۳۲] کہ اللہ تم کو فتح دے[۱۳۳] یا اپنی طرف سے کوئی اور بات ظاہر کر دے[۱۳۴] تو اِنھیں اُس چیز پر پچھتانا پڑے جو اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔ (یقین رکھو کہ اِن کے ساتھ یہی ہوگا) اور ایمان والے (اُس موقع پر) کہیں گے کہ کیا یہ وہی ہیں جو اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر یقین

۱۲۹؎ یعنی اسلام اور مسلمانوں کو اپنے لیے ایک مشترک خطرہ سمجھتے ہیں اور اِن سے نمٹنے کے لیے اِن کے خلاف ملت واحدہ بن چکے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ اب مسلمانوں کو بھی اِن کے خلاف ملت واحدہ بن کر اِن کے ساتھ دوستی اور اعتماد پر مبنی تمام تعلقات و مراسم ختم کر دینے چاہییں۔

۱۳۰؎ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ایمان و اسلام کے اِن دشمنوں سے دوستی کر کے اپنی جان پر ظلم ڈھا رہے ہیں، وہ اُس منزل تک ہرگز نہ پہنچیں گے جو اللہ نے اپنے صاحب ایمان بندوں کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔ اِس طرح کے ظالموں کو وہ اِس کا راستہ کبھی نہیں دکھاتا۔

۱۳۱؎ اصل الفاظ ہیں: 'یَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓی اَنْ تُصِیْبَنَا دَآئِرَۃٌ'۔ لفظ 'قَالَ' جس طرح زبان سے کہنے کے لیے آتا ہے، اِسی طرح دل میں کوئی بات کہنے کے لیے بھی آتا ہے۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں یہ اِسی دوسرے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ آگے 'فَیُصْبِحُوْا عَلٰی مَآ اَسَرُّوْا فِیْٓ اَنْفُسِہِمْ نٰدِمِیْنَ' کے الفاظ میں قرآن نے اِسے کھول بھی دیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> "...مطلب یہ ہے کہ اِن منافقین کے دل میں یہ ڈر سمایا ہوا ہے کہ اِس وقت مسلمانوں اور اُن کے مخالفین میں جو کشمکش برپا ہے، معلوم نہیں یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے، ہوسکتا ہے کہ بالآخر فتح مخالفین ہی کی ہو، ایسی صورت میں اگر ہم مسلمانوں ہی کے ہو کے رہ گئے تو سخت مصیبت میں پھنس جائیں گے، اِس لیے بہتر یہی ہے کہ دونوں سے راہ و رسم باقی رکھنے کی کوشش کی جائے۔" (تدبر قرآن ۲/ ۵۴۴)

۱۳۲؎ اصل میں لفظ 'عَسٰی' استعمال ہوا ہے۔ اپنے عام مفہوم کے علاوہ یہ وعدے کی تعبیر کے لیے بھی ایک لطیف اسلوب ہے۔ یہاں، اگر غور کیجیے تو یہ اِسی دوسرے معنی میں ہے۔

۱۳۳؎ یعنی ایسی فتح جو حق و باطل کے معاملے میں فیصلہ کن ہو جائے۔

جَھۡدَ اَیۡمَانِھِمۡ اِنَّھُمۡ لَمَعَکُمۡ، حَبِطَتۡ اَعۡمَالُھُمۡ فَاَصۡبَحُوۡا خٰسِرِیۡنَ ﴿۵۳﴾
یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا، مَنۡ یَّرۡتَدَّ مِنۡکُمۡ عَنۡ دِیۡنِہٖ فَسَوۡفَ یَاۡتِی اللّٰہُ بِقَوۡمٍ یُّحِبُّھُمۡ وَیُحِبُّوۡنَہٗۤ، اَذِلَّۃٍ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ، یُجَاھِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ، وَلَا یَخَافُوۡنَ لَوۡمَۃَ لَآئِمٍ، ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ، وَاللّٰہُ

دلاتے تھے کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں؟ (افسوس)، اِن کے سب اعمال ضائع ہوئے اور یہ نامراد ہوکر رہ گئے[۱۳۵]۔ ۵۱-۵۳

ایمان والو، (یہ رویہ دین سے پھر جانے کا رویہ ہے۔ چنانچہ یاد رکھو کہ) تم میں سے جو اپنے دین سے پھرے گا، (اللہ کو اُس کی کچھ پروا نہیں ہے)، اِس لیے کہ اللہ عنقریب ایسے لوگ اٹھا دے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور وہ اللہ سے محبت کریں گے[۱۳۶]، مسلمانوں کے لیے نرم اور اِن منکروں کے مقابل میں نہایت سخت ہوں گے[۱۳۷]، اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور (اِس میں) کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کریں گے[۱۳۸]۔ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ (اپنے قانون اور اپنی حکمت کے مطابق) جس کو

۱۳۴؎ یعنی کوئی ایسی بات جس سے اِن منافقین کے تمام راز کھل جائیں اور یہ کچھ کہنے کے قابل نہ رہیں۔

۱۳۵؎ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کے انجام کی تصویر ہے کہ ایمان و اخلاص سے محرومی کے باعث اِن کے تمام اعمال بے نتیجہ ہو جائیں گے اور انجام کار ناکامی و نامرادی کے سوا کچھ بھی اِن کے ہاتھ نہ آئے گا۔

۱۳۶؎ اِس سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہوئی کہ یہ منافقین نہ خدا سے محبت کرتے ہیں اور نہ خدا اِن سے محبت کرتا ہے۔ اللہ و رسول اور مومنین مخلصین کو دوست بنانے کے بجاے اِنھوں نے ایمان و اسلام کے مخالفین سے دوستی کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ چنانچہ اللہ بھی اِن سے بے پروا اور اِن کے رویے سے سخت بے زار ہے۔

۱۳۷؎ یعنی مسلمانوں کے لیے نرم خو، متواضع اور سہل الانقیاد اور منکروں کے مقابل میں پتھر کی چٹان ہوں گے۔ وہ اپنے اغراض کے لیے اِن کو کبھی استعمال نہ کر سکیں گے۔ اِن منافقین کی طرح مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لیے ہوشیار اور منکروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی نہیں ہوں گے کہ اللہ و رسول کے دشمن اِن کو جس طرح چاہیں، نچاتے پھریں۔ اِس میں 'اَذِلَّۃ' اور 'اَعِزَّۃ'، دو لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ استاذ امام نے اِن کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۵۴﴾
اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوا، الَّذِيۡنَ يُقِيۡمُوۡنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤۡتُوۡنَ

چاہے گا، عطا فرمائے گا[۱۳۹]۔ اللہ بڑی وسعت رکھنے والا ہے، وہ سب کچھ جانتا ہے۔۵۴

(یہ تمھارے دوست نہیں ہیں)۔ تمھارے دوست تو حقیقت میں اللہ اور اُس کا رسول اور وہ ایمان والے ہیں جو عجز و نیازمندی اور فروتنی کے ساتھ نماز کا اہتمام کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں[۱۴۰]۔ اور جو اللہ اور

''...'اَذِلَّة'، 'ذلیل' کی جمع ہے۔ عربی میں یہ لفظ... اچھے اور برے، دونوں معنوں میں آتا ہے۔ جب یہ اچھے معنوں میں آتا ہے، جیسا کہ یہاں ہے تو اِس کے معنی نرم خو، نرم مزاج، فرماں بردار، متواضع اور سہل الانقیاد کے ہوتے ہیں۔ 'ذلول' کا لفظ بھی اِسی معنی میں آتا ہے۔ فرماں بردار اونٹنی کو 'ناقۃ ذلول' کہتے ہیں۔

'اَعِزَّة'، 'عزیز' کی جمع ہے۔ یہ لفظ بالکل 'ذلیل' کے مقابل لفظ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس کے معنی ہیں: سخت، مشکل، بھاری، ناقابل شکست، ناقابل عبور، عسیر الانقیاد۔ اگر کسی چیز کے متعلق کہیں کہ 'ھو عزیز علی' تو اِس کے معنی ہوں گے کہ وہ چیز مجھ پر بھاری اور مشکل ہے۔ اِس کو رام کرنا اور قابو میں کرنا میرے لیے دشوار ہے۔ یہی مفہوم 'شدید علیّ' کا بھی ہوتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/۵۴۶)

۱۳۸؎ مطلب یہ ہے کہ محض راہ عشق کے مسافر ہونے کا ڈھنڈورا نہیں پیٹیں گے، بلکہ ہر اُس جدوجہد کا ہراول ہوں گے جو دین کی اقامت اور اُس کی دعوت کے فروغ کے لیے کی جائے گی۔ تمام نصیحتوں اور ملامتوں سے بے پروا ہو کر یہ جدوجہد کریں گے۔ منافقین جن مفادات اور خواہشات و رغبات کے اسیر ہیں، یہ اُن کو کوئی اہمیت نہ دیں گے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس میدان میں اترنے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ آدمی اپنے تمام دوسرے مفادات اور دوسری دل چسپیوں سے منہ موڑ کر اور دوسروں کی نصیحتوں اور ملامتوں سے کان بالکل بند کر کے اترے۔ جو شخص ہر گام پر پیچھے مڑ مڑ کے بھی دیکھے گا اور اپنے ناصحوں اور ملامت گروں کی نصیحتوں اور ملامتوں کو بھی اہمیت دے گا، وہ اگر ایک قدم آگے بڑھائے گا تو دو قدم پیچھے ہٹائے گا۔ عرب شعرا جب اولوالعزمی، بہادری اور فیاضی کا مضمون باندھتے ہیں تو اُس کی تمہید میں ملامت کرنے والیوں کی ملامت کا ذکر ضرور کرتے ہیں، اِس لیے کہ اِس راہ کی یہ سب سے پرانی اور ناگزیر آفت ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ آدمی کوئی عزم و جزم کا کام کرنے اُٹھے اور دہنے بائیں سے کچھ ناصح اور کچھ ملامت گر دامن گیر نہ ہو جائیں۔ یہ اِس راہ کی پہلی آزمایش ہوتی ہے۔ اگر کوئی آدمی دامن جھٹک کے آگے بڑھنے

الزَّکٰوۃَ وَھُمۡ رٰکِعُوۡنَ ﴿۵۵﴾ وَمَنۡ یَّتَوَلَّ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فَاِنَّ حِزۡبَ اللّٰہِ ھُمُ الۡغٰلِبُوۡنَ ﴿۵۶﴾

اُس کے رسول اور سچے ایمان والوں کو اپنا دوست بنا لیں، (وہی غالب ہوں گے[۱۴۱])، اِس لیے کہ اللہ کی جماعت ہی ہے جو غالب رہنے والی ہے[۱۴۲]۔ ۵۵-۵۶

کا حوصلہ نہ رکھتا ہو تو اکثر وہ اِس پہلے ہی مرحلے میں مار کھا جاتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۵۴۷)

۱۳۹؎ یہ پوری آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مخلص ساتھیوں کے لیے تسلی ہے کہ کفر اور اہل کفر کی طرف اِن منافقین کے میلان سے غم زدہ نہ ہوں۔ یہ دین سے پھرے تو اُس کا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔ اللہ اِن کی جگہ اُن لوگوں کو ایمان و اسلام کی توفیق دے گا جو اُن کمزوریوں سے پاک ہوں گے جو اِن کے اندر موجود ہیں۔

۱۴۰؎ اِس سے معلوم ہوا کہ نماز اور زکوٰۃ ایمان کی عملی تعبیر ہے۔ اِسے 'الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا' پر عطف کرنے کے بجاے بدل کا اسلوب اِسی حقیقت کو نمایاں کرنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ اِس کے ساتھ عجز و نیازمندی اور فروتنی کے الفاظ نماز اور زکوٰۃ، دونوں کی اصل روح کی طرف اشارہ کرنے کے لیے آئے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ نماز اور زکوٰۃ کے بغیر جس طرح ایمان بے روح ہے، اِسی طرح عجز و فروتنی نہ ہو تو نماز اور زکوٰۃ بھی محض رسم بن کر رہ جاتے ہیں۔

۱۴۱؎ اوپر فرمایا تھا کہ جو لوگ یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست بنائیں گے، اُن کے اعمال ضائع ہوں گے اور وہ نامراد ہو کر رہ جائیں گے۔ اب یہ اُس کے مقابل میں فرمایا ہے کہ رسول کے ساتھیوں کو لازماً غلبہ حاصل ہو گا اور اُن کے دشمن اِس سرزمین میں لازماً شکست کھائیں گے۔

۱۴۲؎ یہ وجہ بیان فرمائی ہے کہ رسول اور اُس کے ساتھی کیوں غالب ہوں گے؟ فرمایا ہے کہ وہ 'حزب اللہ'، یعنی اللہ کی جماعت ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول کی براہ راست رہنمائی میں کام کر رہی ہے اور اللہ کی جماعت کبھی مغلوب نہیں ہوتی۔ رسولوں کے باب میں یہ اُسی سنت الٰہی کا بیان ہے جو قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُنھیں لازماً غلبہ عطا فرماتے ہیں۔ اِس سے واضح ہے کہ رسول کی جماعت ہی 'حزب اللہ' ہوتی ہے۔ اُس کے بعد کسی جماعت کے لیے یہ تعبیر کسی طرح موزوں نہیں ہے۔

[باقی]

طالب محسن

باہمی قتال کفر ہے

عَنْ جَرِيرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ لِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ: اسْتَنْصِتِ النَّاسَ. ثُمَّ قَالَ: لَا تَرْجِعُوا بَعْدِي كُفَّارًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ.

حضرت جریر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ وسلم نے مجھے حجۃ الوداع کے موقع پر کہا تھا: لوگوں کو چپ کراؤ۔ پھر آپ نے فرمایا: میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ: وَيْحَكُمْ أَوْ قَالَ: وَيْلَكُمْ، لَا تَرْجِعُوا بَعْدِي كُفَّارًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔

لغوی مباحث

'استنصت': فعل امر ہے: اور اس کا مطلب ہے لوگوں کو خاموش کراؤ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ تھی کہ لوگ ان کی بات توجہ سے سنیں۔ اس سے اس بات کی اہمیت واضح ہوتی ہے جو اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کی۔ شارحین نے اس لفظ کے تحت یہ بحث کی ہے کہ اس سے علم کے حصول کے لیے غور سے سننے اور خاموشی اختیار کرنے کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ ہم نے بات کا اصل محل واضح کر دیا ہے۔ شارحین نے جو بات بیان کی ہے، وہ ایک ضمنی بات ہے اور موقع کلام سے اس کی مناسبت بھی ضمنی ہی ہے۔

'ویحکم أو ویلکم': اصل میں یہ دونوں بد دعا کے کلمات ہیں۔ شارحین نے ان کے محل استعمال پر بحث کی ہے۔ بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ 'ویل' کا لفظ اس شخص کے لیے آتا ہے جو ہلاکت میں پڑا ہوا ہو اور اس کا مستحق بھی ہو۔ جبکہ 'ویح' کا لفظ اس شخص کے لیے آتا ہے جو ہلاکت میں پڑا ہوا ہو، مگر اس کا مستحق نہ ہو۔ گویا 'ویل' ایک بد دعا ہے اور 'ویح' کا لفظ ترس کھانے اور ہمدردی کے اظہار کا لفظ ہے۔ ان الفاظ کے مواقع استعمال کو دیکھتے ہوئے یہ بات سامنے آتی ہے کہ 'ویل' کا لفظ 'ویح' کے مقابلے میں سخت ہے، لیکن دونوں ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہو جاتے ہیں اور بد دعا کے علاوہ محض سرزنش کے لیے بھی آ جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں 'ویل' کا لفظ آیا ہے اور بالعموم شدید معنی ہی میں استعمال ہوا ہے۔

'یضرب': روایت میں 'یضرب' کی 'ب' پر پیش ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ اس پر جزم پڑھی جانی چاہیے۔ اس رائے کے مطابق 'یضرب' جواب شرط ہے جس کی شرط بر بنائے قرینہ حذف ہے۔ یہ ایک نحوی امکان ضرور ہے، لیکن مرفوع پڑھنے کی صورت میں عبارت ایک معروف اسلوب پر ہے اور واضح معنی دے رہی ہے۔ لہٰذا ہمارے نزدیک اس پیچیدگی میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔

معنی

یہ روایت حجۃ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خطاب کا ایک حصہ ہے۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے باہمی تفرقے اور جنگ و جدال سے منع فرمایا ہے اور اس کی شناعت واضح کرنے کے لیے یہ اسلوب اختیار کیا ہے کہ میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔ دین کو اختیار کرنے کے بعد مسلمان جب ایک ملت بن گئے تو قرآن مجید میں انھیں ہدایت کی گئی کہ وہ اللہ کی رسی کو مل کر مضبوطی سے پکڑ لیں اور تفرقے میں نہ

پڑیں۔ ہر ملت اس خطرے سے دوچار رہتی ہے کہ ان کے اندر اختلافات پیدا ہوں اور یہ اختلافات اس قدر شدت اختیار کر لیں کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار اٹھا لیں۔ یہ اختلافات ایک دوسرے کی تکفیر کا باعث بنتے، جان کی حرمت جو خدا کی قائم کردہ حد ہے، اس سے تجاوز پر آمادہ کرتے، تہمت، غیبت، سازش، تعصب، حق تلفی اور باطل پرستی، غرض گناہوں کا ایک پورا خاندان ہے جس کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ یہ سارے گناہ مل کر ایک مسلمان کو اس انجام تک پہنچا سکتے ہیں جو ایک کافر کا انجام ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس خطرے کو دیکھ رہے تھے کہ مسلمان ایک جم غفیر ہیں۔ ان میں سے بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو بالکل آخری زمانے میں مسلمان ہوئی ہے۔ آیندہ مسلمانوں میں سیاسی اور مذہبی اختلافات پیدا ہوں گے تو ایسا نہ ہو کہ یہ اپنے ایمان سے بے پروا ہو کر ایک دوسرے پر ہتھیار اٹھا لیں۔ اکابر صحابہ جب تک موجود رہے، وہ اس تعلیم پر پوری طرح عامل رہے۔ ہر دور میں یہ صحابہ رضوان اللہ علیہم کا اسوہ ہی ہے جو امت میں اتحاد کو قائم کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم نے، اختلاف خواہ مذہبی ہو خواہ سیاسی، کبھی اپنے دائرۂ عمل سے تجاوز نہیں کیا۔ جو جہاں اور جس پوزیشن میں تھا، اس نے اسی پوزیشن میں رہتے ہوئے اپنا کام کیا۔ اختلاف راے کیا، لیکن اسے کبھی جدال نہیں بننے دیا۔ سیاسی فیصلے کبھی اپنے ہاتھ میں نہیں لیے اور حکومت کی ذمہ داریاں حکمران ادا کرتے رہے۔ اسی طرح صحابہ رضوان اللہ علیہم کی حکومت جب تک قائم رہی، انھوں نے راے کی آزادی اور احتساب کی جرأت پر کبھی کوئی قدغن عائد نہیں کی۔ آج ہمارا رویہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہی چیز ہے جس نے امت کے اتحاد کو پارہ پارہ کر رکھا ہے۔

کفر کا لفظ، جیسا کہ ہم نے اس سے پچھلی روایات میں تفصیل سے بیان کیا ہے، معاملے کی شناعت اور ایمان کی نعمت اور اعمال صالحہ کے اجر کے بالکلیہ خاتمے کے خطرے کو بیان کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ یہ بات قرآن مجید میں اس قدر واضح ہے کہ اس لفظ کو نہ قانونی معنی میں لینے کی ضرورت ہے اور نہ اس کی کوئی تاویل و توجیہ کی حاجت رہتی ہے۔ قرآن مجید میں کسی مسلمان کو ناحق قتل کرنے پر ابدی جہنم کی سزا بیان ہوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قتل ایک ایسا جرم ہے جو ایمان جیسی بڑی نیکی کو بھی کھا جاتا ہے۔ تفرقہ جب قتل و غارت کی صورت اختیار کر لے گا تو وہ قرآن کے اس فیصلے سے کس طرح مستثنیٰ ہو سکتا ہے۔

متون

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ یہ روایت اصل میں خطبۂ حجۃ الوداع کا ایک جز ہے۔ یہ بات خود امام مسلم نے بھی

ایک متن میں واضح کر دی ہے۔ امام مسلم نے اس روایت کے دو اختلاف نقل کیے ہیں۔ ایک خاموش کراؤ کا جملہ اور دوسرا 'و یحکم' یا 'و یلکم' کا تنبیہی اسلوب۔ دوسری کتب حدیث میں بھی اس جملے کے حوالے سے یہی اختلاف مرقوم ہیں۔ باقی رہی خطبے میں اس جملے کی جگہ تو عام طور پر مفصل روایات میں اس جملے کو جان، مال اور آبرو کی حرمت کے بیان کے بعد رکھا گیا ہے۔ بعض مرویات میں اس جملے سے متصل آپ کا یہ سوال بھی نقل ہوا ہے کہ کیا میں نے پہنچا دیا؟ جس پر لوگوں نے کہا کہ ہاں، آپ نے پہنچا دیا۔ بعض مرویات میں اس جملے کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت بھی روایت ہوئی ہے کہ جو موجود ہے، وہ یہ باتیں ان تک پہنچائے جو موجود نہیں ہیں۔

کتابیات

بخاری، رقم ۱۲۱، ۱۶۵۲، ۴۱۴۱، ۴۱۴۲، ۵۸۱۴، ۶۴۷۴، ۶۴۷۵، ۶۶۶۶، ۶۶۶۷، ۶۶۶۹؛ مسلم، رقم ۶۵-۶۶؛ ابن حبان، رقم ۱۸۷، ۵۹۴۰؛ مستدرک، رقم ۵۹۸۲؛ ابوداؤد، رقم ۴۶۸۶؛ ترمذی، رقم ۲۱۹۳؛ نسائی، رقم ۱۰۶، ۴۱۲۶، ۴۱۲۷، ۴۱۲۹، ۴۱۳۱؛ ابن ماجہ، رقم ۳۹۴۲-۳۹۴۳؛ سنن کبریٰ، رقم ۳۵۹۰-۳۵۹۶، ۵۸۸۲؛ سنن بیہقی، رقم ۹۳۹۶، ۹۳۹۷، ۱۱۲۷۴، ۱۵۶۲۶؛ سنن دارمی، رقم ۱۹۲۱؛ مسند احمد بن حنبل، رقم ۲۰۳۶، ۳۸۱۵، ۵۵۷۸، ۵۶۰۴، ۵۸۰۹، ۵۸۱۰، ۱۶۷۴۴، ۱۹۱۹۰، ۱۹۲۳۷، ۱۹۲۷۹، ۲۰۴۲۳، ۲۰۴۷۹، ۲۰۶۸۵، ۲۰۷۱۴؛ مسند حارث، رقم ۳۸۶، ۶۷۷؛ مسند ابویعلیٰ، رقم ۵۳۲۶، ۵۵۸۶، ۵۵۹۲، ۵۴۴۲؛ مسند طیالسی، رقم ۶۶۴؛ مسند شامیین، رقم ۵۴۶؛ المعجم الکبیر، رقم ۹۱۲، ۹۱۳، ۲۲۷۷، ۲۴۰۲، ۳۵۷۲، ۵۴۴۲، ۶۱۹۷، ۱۰۳۰۱، ۱۳۱۲۱، ۱۳۳۳۶، ۱۳۳۴۸، ۱۵۵۳۴؛ المعجم الاوسط، رقم ۴۲۷، ۶۷۷۷، ۸۴۷۰؛ الآحاد والمثانی، رقم ۱۵۶۷؛ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۷۱۷۴، ۳۷۱۷۶، ۳۷۲۶۶؛ خلق افعال العباد، رقم ۲۸۳، ۲۸۵۔

ریحان احمد یوسفی

بندگی کی دعوت: انسانی مسائل کا حل

(گذشتہ سے پیوستہ)

دین کے جس پیغام کو ہم نے اوپر بیان کیا ہے وہ انسانوں میں اضطراب پیدا کرتا ہے۔ وہ ان کو غفلت کی گہری نیند سے بیدار کرتا اور سطحی اور عارضی مسائل سے اٹھا کر ایک ختم نہ ہونے والے مسئلے سے خبردار کرتا ہے۔ پھر اس کے بعد انہیں وہ راستہ بتاتا ہے جو نہ صرف آخرت کے مسئلے سے انسان کو نجات دلانے والا ہے بلکہ دنیا کے ہر مسئلے کا حل بھی ہے۔ یہ راستہ پروردگار عالم کی بندگی کا راستہ ہے۔ قرآن کے مطابق اس دنیا میں انسان کا مقصدِ تخلیق خدا کی بندگی ہے، (ذاریات 56:51)۔ یہی ہر پیغمبر کی دعوت بھی رہی ہے، (آل عمران 79:3، نحل 36:16)۔ یہی وہ راستہ ہے جو دنیا و آخرت کے ہر مسئلے کا حل ہے۔

بندگی کی یہ دعوت جب خارج میں اپنا ظہور کرتی ہے تو وہ دینِ کامل جنم لیتا ہے جس کا نام اسلام ہے۔ اس دین کو پورے شعور کے ساتھ اختیار کرنے سے ایک خاص قسم کا انسان جنم لیتا ہے۔ ذیل میں ہم اس بندۂ مومن کے خدوخال بیان کر رہے ہیں جو بندگی کی اس دعوت سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہم یہ بتائیں گے کہ بندگی کی یہ دعوت کس طرح انسان کے روحانی، عقلی اور جذباتی مسائل کو حل کرتی ہے اور آخر میں ہم عملی تربیت کا وہ نظام بیان کریں گے جو حقیقی بندۂ مومن کو جنم دے کر اس کے لیے اخروی کامیابی اور دنیوی سکون کا راستہ کھول دیتا ہے اور جس کا قائم کرنا ہمارے پیش نظر ہے۔

بندۂ مومن

قرآن کریم اور سیرت طیبہ کے مطالعے سے ہمیں یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ دین کی دعوت کس طرح کے انسان پیدا

کرنا چاہتی ہے۔اس انسان کی بنیادی صفات درج ذیل ہیں۔

ا۔حکمت وبصیرت

اس دنیا کی ہر دعوت لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے ان کے اندرونی وجود کو اپیل کرتی ہے اور پھر اسی طرح کے لوگ اس کے ساتھ آتے ہیں۔ یہ اپیل جذبات، تعصّبات، خواہشات ، معقولیت وغیرہ میں سے کوئی بھی چیز ہو سکتی ہے۔دعوت کی بنیاد اگر جذبات وتعصّبات ہے تو اس کے گرد جذباتی اور متعصب لوگ ہی جمع ہوتے ہیں اور پھر یہ دعوت ان کا تعصب بڑھاتی چلی جاتی ہے۔اسلام اپنی بنیاد عقل وبصیرت پر رکھتا ہے،اس کو قبول کرنے والے لوگ بھی ایسے ہی ہوتے ہیں اوران کی یہی صلاحیت پھر بڑھتی چلی جاتی ہے۔یہ بات دین کے اعتبار سے بنیادی نہیں، لیکن ہم اس چیز کو آغاز میں اور تفصیل کے ساتھ اس لیے بیان کررہے ہیں کہ ہماری آج کی مذہبی دعوت،حکمت و بصیرت دونوں سے عاری ہے اوراس کے پیدا کردہ مذہبی لوگ جذبات وتعصّبات کا نمونہ ہیں۔

حکمت عقل کا ثمرہ اور بصیرت انسان کے فہم کی طاقت کا اظہار ہے۔عقل وفہم انسان کا سب سے بنیادی وصف ہے جس کی بنا پر انسان قرآنِ کریم کا مخاطب ہونے کا مستحق قرار پاتا ہے۔اسی صلاحیت کی بنیاد پر انسان حواس کے دائرے سے باہر کی چیزوں کو سمجھنے کی منفرد صلاحیت اور جذبات وخواہشات سے بلند ہو کر حقیقت کا ادراک کرنے کا غیر معمولی ملکہ رکھتا ہے۔اسی عقل کی بنیاد پر انسان اس دھرتی کے تمام جانداروں سے قوت و طاقت میں کم ہونے کے باجود زمین کا حکمران ہے۔اسی کی بنیاد پر اس نے پتھر سے تمدن کو جنم دیا اور بحر و بر کو مسخر کرلیا ہے۔انسان روز اپنے گھر، دفتر اور کاروبار کے معاملات صرف اسی عقل کی بنیاد پر بہترین طریقے سے چلاتے ہیں۔مسائل کو حل کرنے کی جتنی صلاحیت عقل میں ہے کسی اور ذریعہ میں نہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں انسان کے اسی شرف کو بنیاد بنا کر اس سے کلام کرتے ہیں۔ بلکہ قرآن کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ توحید وآخرت کی دعوت کو ثابت کرنے کے لیے ان کے تمام تر دلائل عقلی ہوتے ہیں۔وہ اس سطح پر آ کر انسانوں سے گفتگو کرتے ہیں جس سطح سے ایک انسان دوسرے انسان کو بات سمجھاتا ہے۔جو لوگ قرآن کریم کی بات نہیں مانتے،قرآن ان کے بارے میں بار بار یہ کہتا ہے کہ یہ لوگ عقل سے کام نہیں لیتے،سوچتے نہیں، دلائل پر غور نہیں کرتے۔اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ شعوری طور پر قرآن کریم کی بنیاد پر دین سمجھتے ہیں یا وہ جذبات اور خواہشات سے بلند ہو کر خالص عقلی بنیادوں پر معاملات کو دیکھنے کی استعداد رکھتے ہیں،قرآن کریم ان کی اس

استعداد کو مزید بڑھا دیتا ہے۔ یہ عقلی استعداد دو پہلوؤں سے ان کی مددگار بن جاتی ہے۔ ایک یہ کہ ان کی یہ عقلی صلاحیت انھیں خدا کے قرب اور معرفت کی نت نئی بلندیوں سے نوازتی ہے۔ وہ انفس و آفاق اور اپنے احوال پر لمحہ لمحہ غور کر کے خدا کی عظمت اور اس کی عنایات کے نت نئے نشان تلاش کر لیتے ہیں۔ دوسری طرف وہ دنیوی مسائل کے حل میں اس عقل کا بہترین استعمال کر کے اپنے دنیوی معاملات کو بہت بہتر بنا لیتے ہیں۔ ان کی عقل زندگی کے ہر مسئلے کا ایک ایسا حل فراہم کرتی ہے جو بیشتر حالات میں بہت موثر ہوتا ہے۔ جب اجتماعی طور پر یہ سوچ بروئے کار آتی ہے تو ایسے انسان بحر و بر کو مسخر کر لیتے ہیں۔

سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں باتوں کا بہترین نمونہ ہے۔ آپ کی دعائیں اور اذکار یہ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ صبح و شام، لمحہ بہ لمحہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کی کیسی اعلیٰ جہتیں تلاش کر لیتے تھے اور پھر کس طرح وہ حضور کے بے مثل الفاظ میں ڈھل جاتی تھیں۔ اسی طرح عملی زندگی میں حضور نے حکمت اور دانائی کا استعمال کر کے پورے عرب کو فتح کر لیا۔ اس کی بہت کچھ تفصیل سیرت کی کتابوں میں ملتی ہے، جو یہ بتاتی ہے کہ حضور کی اپنی ذات عقل و فہم کے اعتبار سے ایک معجزہ بن چکی تھی جس کا کوئی جواب حضور کے مخالفین کے پاس نہیں رہا تھا۔ ہم اختصار کے پیش نظر حالت جنگ اور حالت امن کی ایک ایک مثال دے کر اپنی بات واضح کریں گے۔

جنگِ احزاب کے موقع پر قریش نے پورے عرب کی طاقت کو جمع کیا اور کم و بیش دس ہزار (بعض روایات کے مطابق چوبیس ہزار) کا ناقابل شکست لشکر لے کر مدینے پر حملہ آور ہوئے۔ کھلے میدان میں اس لشکر کا مقابلہ ناممکن تھا۔ حضور نے اس موقع پر حضرت سلمان فارسی کا مشورہ قبول کیا۔ چنانچہ مدینے کے دفاع کے لیے ایک بڑی خندق کھودی گئی۔ یہ چیز اہل عرب کے لیے قطعی نامانوس تھی۔ چنانچہ ان کی عددی اکثریت قطعاً غیر موثر ہو گئی اور آخر کار انھیں نامراد ہو کر لوٹنا پڑا۔

حالت امن میں اس صلاحیت کی ایک مثال حضور کی شادیاں ہیں۔ بحیثیت رسول یہ مقدر تھا کہ عرب پر حضور کا غلبہ ہو جائے۔ یہ غلبہ اگر قتل و غارت گری کے بعد ہوتا تو اہل عرب کی نفسیات میں اسلام کی محبت پیدا ہوتی اور نہ وہ اسلام کے دست و بازو بنتے۔ چنانچہ حضور نے شادیوں کا وہ راستہ اختیار کیا جو عرب کے حالات میں بہت موثر طریقہ تھا۔ عرب ایک قبائلی سماج تھا۔ قبائلی زندگی میں رشتہ داریاں نصرت و حمایت کی سب سے بڑی وجہ تھیں۔ خاص کر داماد اور سسرالی رشتہ کا احترام وہاں کی روایات میں واجب تھا۔ چنانچہ حضور نے کئی اہم قبیلوں کے سرداروں کی بیٹیوں

سے شادی کی۔ان خواتین میں قریش کے سردار ابوسفیان کی بیٹی حضرت ام حبیبہ، قبیلۂ بنی مصطلق کے سردار کی بیٹی حضرت جویریہ، خیبر کے یہودیوں کے سردار کی بیٹی حضرت صفیہ اور قریش کے سردار حضرت عباس کی سالی حضرت میمونہ جو خود بھی بڑے خاندان سے تھیں، قابل ذکر ہیں۔اس طریقے نے اسلام کے بدترین دشمنوں کو بغیر جنگ اسلام کا حمایتی بنا دیا۔

۲۔خدا میں جینے والا انسان

قرآن کریم کا مرکزی خیال خالقِ کائنات کو انسان سے متعارف کرانا ہے۔یہ کام قرآن کریم پروردگار کی صفات کے بیان سے کرتا ہے۔پھر اس کے ساتھ قرآن کریم انفس و آفاق کی نشانیوں کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ایک معقول انسان جیسے ہی ان صفات اور نشانیوں پر غور کرتا ہے، اس کا پورا وجود خدا کی عظمت کے احساس میں ڈوب جاتا ہے۔اس کے بعد اس کے لیے ممکن نہیں رہتا کہ وہ انسانوں کی عظمت میں جیے، ان کے کے ترانے پڑھے اور ان کی حمد کے نغمے گائے۔

بندۂ مومن کی زندگی کا مقصود خدا کی یاد میں جینا ہوتا ہے۔اس کے سارے جذبات کا رخ اصل میں اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتا ہے۔ ہر خوشی و نعمت میں رب کی حمد کرتا اور ہر مصیبت کے موقع پر اس سے رجوع کرتا ہے۔ظاہر ہے کہ خدا خدا ہے، بت نہیں ہے۔قرآن کے اپنے الفاظ میں اسے پکارنا کنویں پر کھڑے ہو کر پانی کو آواز لگانا نہیں ہے۔کنواں اپنا پانی خود لوگوں کو نہیں دے سکتا۔مگر خدا، جس کے ہاتھ میں سارا نفع و نقصان ہے، ایک زندہ ہستی ہے۔جس طرح ایک انسان دوسرے کی بات سن کر اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اسی طرح خدا بندے کی بات کا جواب دیتا ہے۔اس پر اپنی بہترین رحمتیں اور عنایتیں نازل کرتا ہے۔اسے بندۂ مومن کی زندگی میں اپنے ظہور کے لیے قیامت کے انتظار کی ضرورت نہیں ہوتی۔وہ حالات و اسباب کی شکل میں اپنا ظہور کرتا ہے اور بندے کو ہر لمحہ اپنی موجودگی اور اپنی مدد و نصرت کا احساس دلاتا ہے۔

اس کا نتیجہ بالکل ظاہر ہے بندۂ مومن کی زندگی میں کبھی کوئی ایسا غم نہیں آسکتا جو اسے توڑ ڈالے، اس کی زندگی میں کوئی مایوسی نہیں آسکتی، کوئی حزن نہیں آسکتا، کوئی پچھتاوا نہیں آسکتا، کوئی جذباتی بحران نہیں آسکتا۔اور اس کی زندگی سراپا سکون و اطمینان بن جاتی ہے۔

۳۔آخرت کی سوچ

بندۂ مومن یہ بات جانتا ہے کہ اصل زندگی یہ نہیں جو ابھی موجود ہے۔ یہ تو امتحان ہے۔ اصل زندگی تو موت کے بعد آنے والی آخرت میں شروع ہوگی۔ اس کے بعد بندۂ مومن کا وجود سراپا اضطراب بن جاتا ہے کہ اسے آخرت میں کامیابی حاصل کرنی ہے۔ وہ غفلت و بے نیازی کے بجائے احتساب کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ وہ رب کی اطاعت کا راستہ اختیار کرتا، خیروشر کے تقاضوں کو پورا کرتا اور دنیا کے اچھے برے حالات میں کبھی اعتدال و توازن نہیں کھوتا ہے۔ اس کا اصل کنسرن اور مقصد دنیا کا کھونا اور پانا نہیں بلکہ آخرت کا کھونا اور پانا ہوتا ہے۔ وہ جنت کے خیالوں میں جیتا اور جہنم کے اندیشے سے لرزتا ہے۔ ایسے انسان کا سکون نہ دنیا کا دکھ درد چھین سکتا ہے اور نہ اس کی ذات سے دوسرے انسانوں کو کسی ظلم و زیادتی کا اندیشہ ہوتا ہے۔

۴۔ اخلاقی وجود

دین کی اصل اور بے آمیز دعوت بندۂ مومن پر یہ حقیقت بالکل واضح کر دیتی ہے کہ بندۂ مومن کا امتحان اصل میں اخلاقی میدان میں ہو رہا ہے۔ اسے اپنے اندر کے خیروشر کے شعور کو کبھی مردہ نہیں ہونے دینا، اس کی صدا کو سننا ہے اور اپنے جذبات، خواہشات، مفادات اور تعصّبات کو اس کے تابع کرنا ہے۔ یہ چونکہ بے حد مشکل امتحان ہے اور انسان بار بار پھسلتا ہے اس لیے قرآنِ کریم بھی ان اخلاقی مطالبات کو انداز بدل بدل کر دہراتا ہے۔ یہ اخلاقی رویے جس معاشرے میں عام ہو جائیں وہ معاشرہ دھرتی پر جنت کا نمونہ بن جاتا ہے۔ ایسا ہی ایک معاشرہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے مدینہ میں قائم کیا تھا جہاں بہترین اخلاق کے لوگوں نے کمترین وسائل کے ساتھ ایک فلاحی انسانی معاشرے کا بہترین نمونہ قائم کیا تھا۔

۵۔ شخصی ارتقا

مندرجہ بالا چاروں صفات کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بندۂ مومن کی شخصیت ہر لمحہ اور ہر روز ارتقا پذیر ہوتی ہے۔ وہ ہر دن خدا سے تعلق کی کوئی نئی جہت دریافت کرتا، اس پر اپنے اعتماد میں اضافہ کرتا، اپنی اخلاقی کمزوری کو دور کرتا، اپنے عمل کو بہتر بناتا اور اپنی شخصیت میں پختہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ پختگی زندگی کے ہر مسئلے کو حل کر دیتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات دیگر پہلوؤں کی طرح اس اعتبار سے بھی ایک بہترین نمونہ ہے۔ غزوۂ حنین کے موقع پر آپ کی شخصی مضبوطی کے جو مظاہر سامنے آئے ان کی نظیر ملنا بہت مشکل ہے۔ اس جنگ میں پہلی دفعہ مسلمانوں کا لشکر بارہ ہزار کی ایک بہت بڑی تعداد میں تھا۔ مگر مسلمانوں کا یہ عظیم لشکر دشمنوں کی اچانک تیراندازی سے منتشر ہو گیا اور رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میدان جنگ میں چند لوگوں کے ہمراہ تنہا رہ گئے۔دشمنوں کے نرغے میں ہونے باجود آپ گھبرائے بغیر میدان میں کھڑے رہے اور رجزیہ اشعار پڑھ کر مسلمانوں کو اپنی طرف بلاتے رہے۔آپ کے پکارنے پر مسلمان لوٹے اور جنگ کا نقشہ بدل گیا۔

اس سے زیادہ بڑا واقعہ یہ ہوا کہ اس جنگ کے بعد جب مالِ غنیمت تقسیم ہوا تو آپ نے مکہ کے نومسلموں کو تالیفِ قلب کے لیے بہت کچھ مال دیا۔جس پر کچھ انصار ناراض ہوگئے۔اس موقع پر آپ نے انصار کو اکٹھا کر کے جو تقریر کی اس سے زیادہ موثر تقریر شاید کبھی کسی لیڈر نے نہیں کی ہوگی۔اس تقریر میں آپ نے پہلے انصار کو اپنے احسان یاد دلائے۔ہر احسان کے جواب میں انھوں نے آپ کی تصدیق کی۔پھر آپ نے فرمایا کہ نہیں اے انصار تم کہہ سکتے ہو کہ ساری دنیا نے تم کو جھٹلایا ہم نے تمھاری تصدیق کی،سب نے تمھیں چھوڑ دیا ہم نے پناہ دی، تم محتاج تھے ہم نے تمھاری مدد کی۔تم یہ کہو تو میں تمھاری سب باتوں کی تصدیق کروں گا۔لیکن دیکھو میں نے یہ بھیڑ بکریاں نئے ایمان لانے والوں کو ان کے حق کے طور پر نہیں، بلکہ تالیفِ قلب کے لیے دی ہیں۔کیا تمھیں یہ پسند نہیں کہ لوگ بھیڑ بکریاں لے جائیں اور تم محمد کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔یہ الفاظ سنتے ہی انصار رو پڑے اور روتے روتے ان کی داڑھیاں تر ہوگئیں۔یوں دلوں میں دوریاں پیدا کرنے والا ایک مسئلہ محبت میں اضافے کے ساتھ ختم ہوگیا۔

اپنے اور غیروں کے ساتھ زندگی کے ہر معاملے میں یہی مضبوط شخصیت ہر مسئلے اور مشکل کو حل کرتی اور ہر صورت حال سے نکلنے کا ایک راستہ دیتی ہے۔

بندگی کی دعوت: انسان کے روحانی وجود کی تکمیل

بندگی کی آسمانی دعوت جس بندۂ مومن کو پیدا کرتی ہے،اس کی مطلوب صفات کو سمجھنے لینے کے بعد یہ جاننا بھی اہم ہے کہ بندگی کی یہ دعوت کس طرح اس انسانی شخصیت پر اثر کرتی ہے جس کا تجزیہ ہم شروع میں کر چکے ہیں۔انسانی شخصیت کی اُس بحث میں ہم نے یہ بیان کیا تھا کہ انسان کا اصل وجود اس کا وہ نفسی یا روحانی وجود ہے جو خدا کی اپنی پھونکی ہوئی روح سے پیدا ہوا ہے، (ص 38:72،سجدہ 32:9)۔اس پھونک کے نتیجے میں انسان کا وجود قرب الٰہی کی خوشبو سے مہک اٹھتا ہے۔لیکن دنیا میں آنے کے بعد یہ مہک حیوانی وجود کی کثافت سے اس طرح مغلوب ہوجاتی ہے کہ انسان اس خوشبو کی یاد بھول جاتا ہے۔مگر جیسے ہی اسلام کی دعوتِ عبادتِ رب سامنے آتی ہے انسان کے قلب میں جاگزیں پرانی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔انسانی عقل اور ارادہ مفادات،تعصّبات اور خواہشات کے ڈھیر کو

پردے ہٹانے میں کامیاب ہو جائے تو انسان کبھی دھوکہ نہیں کھا سکتا کہ جس بوئے معطر سے اس کا وجود روز ازل مہکا تھا، وہی خوشبو آج پھر اس کے قریب مہک رہی ہے۔ روح انسان پر اس کا یہی وہ اثر ہے جس کے نتیجے میں دل اللہ کی یاد سے سکون و اطمینان پاتے ہیں، (رعد 28:13)۔ اور جس کے بعد انسان ساری زندگی قرب خداوندی کی روحانی مہک کے سہارے گزار دیتا ہے۔

اسلام ایک عقلی روحانی مذہب

اسلام معروف معنوں میں کوئی روحانی مذہب نہیں۔ یہ گرچہ انسان کے روحانی تقاضوں کی مکمل اور بھرپور تسکین کرتا ہے، مگر اس کا راستہ عقل و شعور کا راستہ ہے نہ کہ عقل کو معطل کر کے مراقبہ و مشاہدۂ حق کی کوششوں کے ذریعے قرب الٰہی کا۔ ہم نے انسان کے وجود کا جو تجزیہ کیا ہے اس میں یہ بات واضح ہے کہ انسان کا اصل شرف اور قوت اس کی عقل ہے۔ دین اس کو مخاطب کرتا ہے اور اسی کی بنیاد پر لوگوں کو اپنی بات کو پرکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ دعوت جب قبول کر لی جاتی ہے تو دین اسی عقلی وجود کی صلاحیتوں یعنی یادداشت، تجزیہ و تحلیل، غور و فکر، تصور و تخیل کو استعمال کر کے خدا سے قربت پیدا کرتا ہے۔ اس کا پیغام یہ ہے کہ انھی صلاحیتوں کو استعمال کر کے زندگی کے ہر سرد و گرم اور صبح و شام خدا کو یاد رکھو اور حیات و کائنات کے ہر گوشے پر نظر ڈال کر خدا کی صناعی پر غور کرو۔

زمانۂ قدیم میں شاید اس بات کی اہمیت نمایاں نہیں ہوتی، مگر دور جدید میں جب انھی عقلی صلاحیتوں کی بنیاد پر انسانوں نے بن دیکھے ایک نیا عالم دریافت کر لیا ہے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پردۂ غیب میں مستور خالق کو دریافت کرنے کی کتنی جہتیں اس کے دائرہ امکان میں ہوں گی۔ انسان اپنے فہم و ادراک اور عقل و تصور کی بنیاد پر اپنے رب سے ایک انتہائی گہرا اور زندہ تعلق پیدا کر سکتا ہے اور ان صلاحیتوں سے حاصل ہونے والی معرفت بے حد اعلیٰ اور اس سے پیدا ہونے والی محبت بے حد شدید ہوتی ہے۔ یہ تعلق، محبت اور معرفت اس عقلیت سے عبارت ہے جو کائنات پر غور و فکر کر کے خدا، جنت اور جہنم کے غیبی حقائق کی معرفت سے حاصل ہوتی ہے، (آل عمران 191:3)۔ یہ بن دیکھے صرف عقلی بنیاد پر خدا کو مان لینا ہے (بقرہ 3:2)۔ زندگی کو اس کی بندگی کے رنگ میں رنگ لینا ہے (بقرہ 138:2)۔ اٹھتے، بیٹھتے اور کروٹوں پر اسے یاد کرنا ہے (آل عمران 191:3)۔ اس کی یاد کو دل کا چین بنا لینا ہے، (رعد 28:13)۔ یہ قطرے کا سمندر میں گرنا نہیں بلکہ بندے کا سجدے میں رب کا قرب حاصل کرنا ہے۔ (علق 19:96)۔ یہ مصائب میں کسی بزرگ سے فریاد کرنا نہیں، بلکہ گڑگڑا کر اور چپکے چپکے اپنے

رب کو پکارنا ہے (اعراف:۵۵)۔ خیر و شر کی جد و جہد سے بے نیازی کا نام نہیں، خدا کی طرف بلانے اور اس راہ میں صبر اور اعلیٰ اخلاق پر جمے رہنے کے آہنی عزم کا نام ہے، (فصلت 41:35-33)۔ اور سب سے بڑھ کر یہ اپنی شخصیت کو سیرتِ حبیب کے اسوۂ حسنہ میں ڈھال لینے کا نام ہے۔

عقل پر مبنی اس روحانیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے عبادات کا وہ نظام بھی عطا فرمایا ہے جو انسان کو ذاتی سطح پر اللہ تعالیٰ سے جوڑ دیتی ہیں۔ دعا، ذکر، معرفت اور عبادت پر مبنی یہ ذاتی تعلق اس بے کس اور کمزور انسان کا سب سے بڑا سہارا ہے جسے اس زندگی میں قدم قدم پر مایوسیوں اور ناکامیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ایک روحانی انسان خدا سے اتنا زیادہ قریب ہو کر جیتا ہے کہ اس دنیا کا کوئی دکھ اس کا سکون درہم برہم نہیں کر پاتا۔ اور کبھی وہ خود ٹوٹنے لگے تو رب العالمین بکھرنے سے پہلے ہی اسے سمیٹ لیتا ہے۔

وجود انسانی کی مکمل تسکین

اسلام گرچہ ایک مکمل روحانی اور عقلی پیکج ہے جو انسان کی روحانی طلب اور عقلی تقاضوں دونوں کا بھرپور جواب ہے، لیکن اس واقعہ سے اس حقیقت پر کوئی فرق نہیں پڑتا کہ انسان پر عام حالات میں اس کے حیوانی تقاضے ہی غالب رہتے ہیں۔ انسان کا حیوانی شعور اس کے ذوقِ جمال اور ضمیر کے ساتھ مل کر خوشی اور راحت کی ایک ایسی دنیا کی تعمیر چاہتے ہیں جہاں ہر محرومی اور مایوسی سے بچ کر انسان کو روحانی سرشاری کے ساتھ مادی عیش و راحت اور ضمیر کی مکمل تسکین بھی میسر ہو۔ یہی وہ جنت ہے جسے انسان اس دنیا میں تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ مگر اس جنت میں بار بار محرومی، مایوسی، اکتاہٹ، دکھ اور غم کا سانپ داخل ہوتا ہے اور انسان کو ڈس لیتا ہے۔ یا پھر، جیسا کہ پیچھے ہم نے بیان کیا ہے کہ اس سانپ کو مارنے کی کوشش میں انسان اپنے ضمیر کو بھی مار ڈالتا ہے۔ ہر دو کا نتیجہ جذباتی عدم تسکین اور روحانی اضطراب ہے۔

اسلام کا کمال یہ ہے کہ وہ اس مسئلے کا ایک مکمل حل دیتا ہے۔ اسلام اپنے پیرووں کو اس دنیا کے بجائے آنے والی دنیا میں جنت کی تعمیر کا نصب العین دیتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انسان کو دنیا میں تزکیہ کا مشن دیا گیا ہے۔ یعنی دنیا کی آلائشوں میں رہتے ہوئے اپنے آپ کو پاک رکھنا۔ وہ انسان کو بتاتا ہے کہ اس کے کسی حیوانی تقاضے اور ذوقِ جمال پر کوئی پابندی نہیں، (اعراف 7:32-31)۔ سوائے اخلاق و شریعت کی ان فطری پابندیوں کے جو بظاہر حیوانی وجود کو کچھ لگام ڈالتی ہیں، مگر درحقیقت وہ کئی پہلوؤں سے انسان کی تسکین کا اہتمام کرتی ہیں۔ ایک یہ کہ ا

ان پابندیوں کی وجہ سے انسان اس مادی دوڑ سے الگ ہونے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے جس میں کودنے کا نتیجہ مایوسی اور اکتاہٹ کے سوا کچھ نہیں ۔ یوں انسان ایک تکلیف دہ مرحلے سے بچ جاتا ہے۔ دوسرے یہ پابندیاں انسان کے نفس کا تزکیہ کر کے اس کے روحانی وجود کی غذا بن جاتیں اور اس کی قوت و طاقت کا سبب بنتی ہیں۔ پھر انھیں نفس انسانی کے ضمیر کی بھرپور حمایت حاصل ہوتی ہے اور ان پر عمل کے بعد ملنے والی روحانی طمانیت اپنی ذات میں بہت بڑی نعمت ہے۔ تیسرے یہ کہ ان پابندیوں سے انسان میں وہ احساسِ عبدیت پیدا ہوتا ہے جو اسے یاد دلاتا ہے کہ دنیا میں وہ ایک عاجز بندہ ہے ۔ یہ عجز کا احساس زندگی میں پیش آنے والے ناگزیر مصائب و آلام کے باوجود جینے کا حوصلہ دیتا ہے۔ سب سے بڑھ کر دین کی یہ یقین دہانی اس کے پاس ہوتی ہے کہ پابندیوں اور مصائب پر صبر کا نتیجہ ختم نہ ہونے والی وہ ابدی بادشاہی ہے جو انسان کو ماضی کے ہر پچھتاوے اور مستقبل کے ہر اندیشے سے بے نیاز کر دے گی ۔

اس پوری بات پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ بندۂ مومن دنیا کی ہر راحت سے استفادہ کرتا ہے اور غیر ضروری طور پر ان کے پیچھے بھاگنے کی کلفت سے بھی محفوظ رہتا ہے۔ محرومی اور دکھ کے ہر جذباتی صدمے کے وقت ایک طرف خدا کی یاد اس کے ساتھ ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ یقین کہ بہت جلد اس کے سینے میں لگی ہر پھانس کھینچ لی جائے گی اور اس چبھن کے بدلے میں آنکھوں کو ٹھنڈا کر دینے والی وہ نعمتیں ملیں گی جن کا تصور بھی روح و قلب کو سرشار کر دینے کے لیے بہت ہے۔ بندۂ مومن اس یقین کے سہارے جذبات کے ہر بحران سے سرخرو ہو کر نکلتا ہے۔

تربیت کا نظام

ہماری یہ گفتگو بڑی حد تک مکمل ہو گئی ہے۔ مگر اس کا وہ آخری جز باقی ہے جس کے لیے یہ پوری گفتگو کی گئی ہے۔ یعنی انسانوں میں مطلوبہ تبدیلیاں کیسے لائی جائیں۔ اس کے لیے تعلیم و تربیت کا کیا نظام تشکیل دیا جائے۔ ہمارے نزدیک اس نظام کے تین اجزا ہیں۔ ایک فرد کی شخصیت میں تبدیلی کو نشانہ بنایا جائے، دوسرے صحیح علم کی ترویج اور تیسرے اسے اس کے اپنے ماحول سے نکال کر فطری ماحول میں رکھ کر عملی تربیت دی جائے۔

۱۔ فرد کی شخصیت میں تبدیلی

دورِ جدید میں یہ بڑی بدقسمتی ہوئی ہے کہ لوگوں نے یا تو حکومتی سطح پر تبدیلی کو اسلام کی دعوت بنا کر پیش کیا ہے یا

پھر فرد کے ظاہری وجود میں تبدیلی کو دین کا مطلوب قرار دیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ دونوں باتیں ٹھیک نہیں ہیں۔اسلام کا اصل نشانہ فرد کے مائنڈ سیٹ (Mindset) یعنی اس طرز فکر میں تبدیلی ہے جو اس کے عمل کو متعین کرتا ہے۔قرآن کریم سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ دین کا مخاطب فرد ہے اور قرآن اسے مخاطب بنا کر اس کے مائنڈ سیٹ کو بدلنا چاہتا ہے۔اس کے بعد انسان کا عمل بدلتا ہے اور اس کے ظاہر میں بھی مطلوبہ تبدیلیاں آنے لگتی ہیں۔یہی اسلام کا طریقہ ہے، خارج سے چیزیں ٹھونسنا اسلام کا طریقہ نہیں۔

اجتماعی تبدیلیوں کا راستہ بھی یہی ہے۔افراد جب ملتے ہیں تو معاشرہ وجود میں آتا ہے۔جب ایک ایک فرد کی اصلاح ہوتی چلی جاتی ہے تو آخر کار پورے معاشرے میں مجموعی طور پر خیر غالب ہو جاتا ہے۔یہی اسلام میں اجتماعی تبدیلی کا اصول ہے جو اپنے منتہائے کمال کو پہنچ کر معاشرے کو سکون وامن سے بھر دیتی ہے۔زمین اپنے خزانے انڈیل دیتی اور آسمان رزق کی بارش کر دیتا ہے۔مگر جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ اس کا نقطۂ آغاز فرد میں تبدیلی ہے۔

۲۔صحیح علم کی ترویج

فرد کو نشانہ بنانے کے بعد ضروری ہے کہ اس کا علم بدلا جائے۔اس معاشرے میں اکثر لوگ بنیادی دینی تعلیم نہیں رکھتے۔ جو لوگ دین کا علم رکھتے ہیں وہ زیادہ تر سنی سنائی باتیں، توہمات اور لوگوں کے اپنے خود ساختہ نظریات ہیں۔جو لوگ بہتر علم رکھتے ہیں وہ عام طور پر دین کی ترجیحات کا ایک غلط تصور رکھتے ہیں۔ان سب چیزوں کا علاج یہ ہے کہ قرآنِ کریم اور سنت کو بنیاد بنا کر دین کا صحیح علم صحیح توازن کے ساتھ انہیں دیا جائے۔ہم نے اس سلسلے میں جو نصاب بنایا ہے، اس کی اہم خصوصیات درج ذیل ہیں۔

۱۔قرآن کریم کے طرز استدلال سے واقفیت

ہمارے ہاں قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھنے کا رواج نہیں۔اس لیے لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس میں کیا لکھا ہے اور قرآن کا طریقۂ استدلال کیا ہے۔ہم چاہتے ہیں لوگ اس بات سے ضرور واقف ہوں کہ دین کی یہ بنیادی کتاب اپنی دعوت کو کس طرح پیش کرتی ہے۔اس مقصد کے لیے ہمارے پیش نظر قرآنِ کریم کی بنیادی دعوت یعنی توحید، آخرت اور رسالت کو دلائل کے ساتھ ثابت کرنے والی آیات کے ایک منتخب نصاب کا مطالعہ ہے۔جن سے یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ قرآن کریم تعصّبات وجذبات پر نہیں بلکہ عقل وبصیرت کی بنیاد پر لوگوں کو مخاطب کرتا ہے۔

۲۔ توحید اور سزا وجزا سے متعلق آیات

قرآنِ کریم کے حوالے سے دوسری چیز قرآنِ کریم کے ان بیانات سے لوگوں کو روشناس کرانا ہے جن کا تعلق توحید و آخرت سے ہے۔ یہ چیزیں اس لیے ضروری ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور آخرت کی زندگی کا ایک بھرپور نقشہ لوگوں کی نظر کے سامنے آ جائے۔

۳۔ قرآن کا مطلوب انسان

قرآن کریم کے حوالے سے تیسری چیز قرآن کے ان مقامات کا مطالعہ ہے جن میں وہ یہ بتاتا ہے کہ اسے کن صفات کے حامل لوگ مطلوب ہیں۔ یہ کم وبیش 23 مقامات ہیں جن سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ دین انسان سے کیا چاہتا ہے اور کس نوعیت کی اخلاقی صفات ان میں دیکھنا چاہتا ہے۔

۴۔ بنیادی شریعت کی تعلیم

ایک فرد کو یہ بتانا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے کیا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مطالبات دین کا وہ حصہ ہے جسے بطور شریعت فرض کیا گیا ہے۔ ان میں عبادات اور معاشرت وغیرہ کے حوالے سے دین کے مطلوبہ اعمال کی تعلیم شامل ہے۔

۵۔ احادیث کی روشنی میں حضور کی سیرت کا مطالعہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت دین کا بہترین عملی نمونہ ہے۔ اس کا ریکارڈ احادیث کے ذخیرے میں ہمارے پاس موجود ہے۔ چنانچہ حضور کی سیرت وشخصیت کے وہ پہلو جن میں آپ کا خالق ومخلوق کے ساتھ تعلق واضح ہوتا ہے ان کی تعلیم بھی اس نصاب کا ایک حصہ ہے۔

۶۔ شخصی اصلاح

انسانی شخصیت کے بیان میں ہم نے یہ بات بیان کی ہے کہ انسان کے ہوش سنبھالنے سے قبل خارجی عوامل یعنی وراثت، ماحول اور تربیت اس کی شخصیت پر اپنا اثر ڈال چکے ہوتے ہیں۔ پھر زندگی بھر انسان جس ماحول میں جیتا ہے، وہ بھی اس کو متاثر کرتا رہتا ہے۔ اس سب کی بنا پر انسانی شخصیت میں بعض بنیادی کمزوریاں آ جاتی ہیں۔ یہ کمزوریاں اپنی ذات میں کوئی ایمانی یا اخلاقی خرابی نہیں ہوتیں، لیکن ان کی طرف لے جانے یا بہت سی اخلاقی خوبیوں سے محروم کرنے کا سبب بن جاتی ہیں۔ اسی طرح یہ دنیوی اعتبار سے انسان کو بہت سے نقصانات پہنچاتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ دور جدید کی مینجمنٹ سائنس نے اسے اپنا موضوع بنالیا ہے۔

یہی وہ چیز ہے جس کی بنا پر بہت سے لوگ جو دینی تعلیم سے واقف اور اصلاح کے خواہشمند ہوتے ہیں، ان کے اخلاقی رویے بھی بہتر نہیں ہو پاتے اور دنیا میں بھی وہ بار بار نقصان اٹھاتے ہیں۔ ہم چونکہ دین و دنیا دونوں میں بہتری کے خواہشمند ہیں اس لیے افراد کی شخصی تربیت کر کے ان خامیوں کی اصلاح بھی ہمارے پیش نظر ہے۔

۲۔ معلمین و معلمات کی تیاری

ہمارے پیش نظر فرد کی تربیت ہے۔ یہ کام بڑے پیمانے پر اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس عمل کو سرانجام دینے والے لوگ ایک بڑی تعداد میں نہ پیدا ہو جائیں۔ اس مقصد کے لیے ہم چاہتے ہیں کہ ایسے خواتین و حضرات کو تیار کیا جائے جو مندرجہ بالا نصاب کی بنیاد پر دوسروں کو تربیت دیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے انہیں درج بالا چیزوں کے علاوہ کچھ مزید چیزوں کی تعلیم کی ضرورت ہو گی۔ اس کا ہم خصوصی طور پر انہی لوگوں کے لیے اہتمام کریں گے۔

۳۔ ماحول کی تبدیلی

آج کی مادی زندگی بے حد تیز رفتار اور اس کے مطالبات اور دلچسپیاں ان گنت ہیں۔ پھر جس انفارمیشن ایج میں ہم جی رہے ہیں وہاں ہر لمحے میڈیا وغیرہ کے ذریعے سے انسان پر معلومات کی بمباری ہو رہی ہوتی ہے۔ حالات و واقعات خواہ اس سے متعلق ہوں یا نہیں ہمہ وقت اسے متوجہ کیے رہتے ہیں۔ یہ صورت حال اسے یکسو نہیں رہنے دیتی۔ اس کے ساتھ زندگی کی تیز رفتاری میں کسی کے پاس شاید اتنا وقت نہیں کہ وہ بیٹھے اور اپنی شخصیت اور مسائل کا تجزیہ کرے اور حیات و کائنات کی گہری حقیقتوں پر غور و فکر کر سکے۔ انسان اگر یہ کر بھی لے اور دین سیکھنے کے لیے کچھ وقت نکال بھی لے تب بھی وہ جیسے ہی اپنے ماحول میں لوٹتا ہے، وہ سب بھول جاتا ہے اور ہر تعلیم غیر مؤثر ہو جاتی ہے۔

اس پس منظر میں یہ ایک ضرورت ہے کہ لوگوں کو کچھ عرصے کے لیے ان کے ماحول سے کاٹ کر نکالا جائے اور وہاں ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جائے۔ فطرت کے ماحول میں رکھ کر اور زندگی کی تیزی سے کچھ عرصے دور رکھ کر ان کو حیات و کائنات کی حقیقتوں سے نہ صرف آگاہ کیا جائے بلکہ ان کے شعور کی اس طرح تربیت کی جائے کہ وہ خود ان پر غور کرنے کے قابل ہو سکیں۔ اس طرح کہ یہ حقائق ان کی اپنی دریافت بن جائیں اور پھر اس روشنی میں وہ اپنی زندگی، معمولات، ترجیحات اور شخصیت کا جائزہ لینے پر آمادہ ہو جائیں۔ وہ اپنے مقاصد زندگی کو از سر نو متعین کرنے، اپنی شخصیت کی اصلاح کرنے، اپنے اخلاق کو بہتر بنانے، اپنے علم میں اضافہ کرنے اور اپنے حالات میں

تبدیلی لانے کا عزم کرلیں۔

انسانی شعور کی یہ تربیت اور فکر میں یہ تبدیلی قرآنِ کریم کے پیغام، نبی کریم کے اسوۂ حسنہ، شریعتِ مطہرہ کی حدود انسانی فطرت کے تقاضوں اور انسانی شخصیت کے اس تجزیے کی روشنی میں کی جائے گی جس کا کچھ ذکر پیچھے کیا جا چکا ہے۔ اس جگہ کو ہم قدیم تصوف کے طرز پر خانقاہ سے تعبیر کرتے ہیں گو اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ ایک تربیت گاہ ہے۔

تصوف اور ہمارے طریقِ کار کا فرق

خانقاہ کا ذکر آ گیا اور بحث کا اختتام بھی ہو رہا ہے، ایسے میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے طرز تربیت اور تصوف سے پیدا ہونے والے نتائج کا فرق واضح کر دیا جائے۔ ہم نے شروع میں عرض کیا تھا کہ تصوف کے مابعد الطبیعاتی اور فلسفیانہ پہلو سے قطع نظر، اس کی اخلاقی روایت، نفس انسانی کی تربیت اور خاص کر انسانی شخصیت کے عقدے سلجھانے کی اس کی صلاحیت واقعتاً ایک قابل تقلید چیز ہے۔ ہمیں اصولی طور پر اس پہلو سے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ قدیم زمانے میں خانقاہی ماحول یہی کام کیا کرتا تھا، اس لیے ہم نے اس کو لے لیا ہے۔ تاہم بعض بنیادی فرق کی بنا پر دونوں سے نکلنے والے نتائج میں بہت فرق ہے۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ قرآنی تصور: ہم جس تصور بندگی کی طرف بلا رہے ہیں اس کا نام، مقصد، مقصد کے حصول کے ذرائع سب کچھ قرآنِ کریم سے ماخوذ ہیں۔ یہ رب کے بندوں کو اس کی اطاعت و محبت کے حصار میں لا ڈالنے کا نام ہے۔ یہ عبد و معبود کے تعلق کا نام ہے جو اس دنیا میں اس کی یاد میں اور آنے والی دنیا میں اس کے قرب میں جینے کا نام ہے۔ برخلاف تصوف کے جو قطرے کو سمندر اور جز کو کل سے ملانے کا نام ہے اور جس کا مقصود عاشق و معشوق کا وصال ہے۔ پہلا سر تا سر ایک قرآنی تصور ہے اور دوسرے کے ذکر سے خدا کا کلام اور اس کے نبی کی سیرت خالی ہے۔ قرآن اور نبی کو چھوڑ کر یہ راستہ اختیار کرنا ایک بہت خطرناک بات ہے، جس کے نتائج سے تصوف کی تاریخ بھری پڑی ہے۔

۲۔ عقل و دل: تصوف اور ربانیت دونوں ایک نوعیت سے روحانی سکون دیتے ہیں لیکن پہلا تصورِ روحانیت ریاضت و مجاہدات، مراقبہ و مشاہدات اور خاص طرح کے اذکار و وظائف سے قلب کی بیداری پر مبنی ہے۔ اس طریقے میں انسانی وجود کی اصل طاقت یعنی عقلی استعداد و بصیرت کو پہلے ہی مرحلے پر ذبح کر دیا جاتا ہے۔ جبکہ بندگی کی

دعوت جیسا کہ ہم نے پیچھے واضح کیا، اپنا مخاطب عقل کو بناتی، اسی کو بیدار کرتی، اسی کے قویٰ کو استعمال کر کے خدا کے قرب (نہ کہ مشاہدۂ ذاتِ حق) کے احساس میں زندہ رکھتی ہے۔ انسان کی عقل کی یہ بیداری ایک طرف اسے خدا سے ہمہ وقت زندہ تعلق پیدا کر کے سچی روحانیت سے ہمکنار کرتی ہے اور دوسری طرف یہ انسان کو مسائلِ زندگی کو بھی عقلی بنیادوں پر حل کرنے کا درس دیتی ہے جو تصوف کے طریقۂ وظائف کی بہ نسبت مسائل و مشکلات کے گرداب سے انسان کو نکالنے میں کہیں زیادہ مؤثر ہے۔

۳۔ سکون و اضطراب: عملی زندگی کی جدوجہد اور عقلی سوالات سے نجات پا کر جو سکون حاصل کیا جائے، وہ بظاہر ایک بہت اچھی اور مطلوب چیز لگتی ہے۔ مگر اس دنیا میں انسان جن قوانین کے تحت موجود ہے، ان میں ایک قانون یہ ہے کہ یہاں اضطراب زندگی کی اور اس طرح کا سکون موت کی علامت ہے۔ انسان کی ہر ترقی، کامرانی اور کامیابی اضطراب سے پیدا ہوتی ہے۔ تصوف انسان کو سکون دینے کا وہ راستہ اختیار کرتا ہے جو اکثر عقل اور عمل دونوں سے دوری پیدا کرتا ہے۔ یہ سکون بتدریج فرد اور معاشرے کے اعضا و قویٰ کو مضمحل کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ فرد کی سطح پر بے عملی اور اجتماعی سطح پر معاشرتی زوال ہے۔ جبکہ اسلام کی دعوت ایک اضطراب سے شروع ہوتی ہے۔ یہ اضطراب آخرت میں خدا کے حضور پیشی کے اندیشے اور جنت کی وادی میں بسنے کی شدید خواہش سے پیدا ہوتا ہے۔ خدا پرستی کی راہ جذباتی، عقلی اور روحانی اضطراب سے نجات دلا کر قلب کو اطمینان اور ذہن کو سکون بخشتی ہے، مگر اس اضطراب کو کبھی ختم نہیں کرتی۔ یہ اضطراب کوئی تکلیف دہ شے نہیں، بلکہ عمل پر آمادہ کرنے والی ایک چیز ہے جو دنیا و آخرت میں ترقی، کامیابی اور حسنات کے حصول کا ضامن بن جاتا ہے۔

۴۔ مرشد و معلم کا فرق: تصوف کا راستہ شیخ اور مرشد کی رہنمائی میں طے کیا جاتا ہے۔ شیخ کی ہستی وہ اتھارٹی رکھتی ہے جو ناقابل چیلنج ہے۔ شیخ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر انسان محسوس پرستی کے مادی دروازے سے روحانیت کے حرم میں داخل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کی خوگر پیکر محسوس طبیعت کو اس طریقے سے بڑی مناسبت ہے۔ پھر اس طریقے میں انسان جذباتی طور پر بہت سکون محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ شیخ کا وجود انسان کے آنسوؤں کے لیے ایک تکیہ، سر ٹکا کر رونے کے لیے ایک کندھا، مادی کثافت اور جذباتی ابال کے نکاس کے لیے ایک کھلا راستہ فراہم کرتا ہے۔ مگر اس مؤثر طریقے میں اتنی ہی خرابیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، لیکن تاریخ میں شخصیت پرستی سے لے کر نفس پرستی تک کے سارے دروازے اسی راستے سے کھلتے نظر آتے ہیں۔

اس کے برعکس ربانیت مبنی بر معلم طریقہ ہے جس میں انسان ایک استاد کی رہنمائی میں دین کی سمجھ اور تعلیم و تربیت حاصل کر کے خدا سے قریب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں کئی جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ منصب بیان کیا ہے کہ آپ لوگوں کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے کر ان کا تزکیہ کرتے ہیں۔ صرف یہی ایک بات اس طریقے کی موزونیت واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ معلّم اور معلم شیخ کی نہیں، بلکہ ماں اور باپ کی جگہ سے معاملہ کرتے ہیں۔ یہ وہ ماں باپ ہیں جو اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد انسان کو اپنی ذات کے بجائے پروردگار سے جوڑنا ہوتا ہے۔ یہ صرف رہنمائی کرتے ہیں، سکھاتے ہیں اور سمجھاتے ہیں۔ سوالو ں کے جواب دیتے، الجھنوں کو رفع کرتے، شبہات کو دور کرتے اور مسائل کی گرہ کھولتے ہیں۔ ان سے انسان کو فطری طور پر انس تو ہو سکتا ہے، مگر وہ انھیں قابل اصلاح بھی سمجھتا ہے اور قابل تنقید بھی۔ ان سے محبت تو ہو سکتی ہے، مگر انھیں محبوب نہیں بنایا جا سکتا۔ ان کی بات تو مانی جا سکتی ہے، مگر انھیں اطاعت کا مرجع نہیں بنایا جا سکتا۔

ربانی معلم کی انگلی پکڑ کر چلنے والے کی منزل رب کی عبادت، اس کا شوق، اس کی محبت اور اسی کا قرب ہوتی ہے۔ معلم اور متعلم دونوں رب کی عظمت میں جینے والے، اسے سہارا بنانے والے اور اسی کی محبت میں سرشار رہنے والے ہوتے ہیں۔ ان کے آنسوؤں کے لیے تکیہ، سر ٹکا کر رونے کے لیے کندھا، مادی کثافت اور جذباتی ابال کے نکاس کے لیے راستہ خدا ہی کی ذات اور اس کی یاد ہوتی ہے۔ ربانی انسان خدا کی عظمت میں جینے کے ایسے عادی ہوتے ہیں کہ غیر کی عظمت کے تصور سے ان کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ ان کا گنج بخش، فیض رساں کوئی مظہر نورِ خدا نہیں، خود نورِ خداوندی ہوتا ہے۔ وہی ناقصوں کا پیر کامل اور کاملوں کا رہنما ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دو تصورات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

خاتمہ بحث

آج کا انسان سکون چاہتا ہے۔ اس نے اپنے سکون کے کچھ طریقے بھی ڈھونڈ لیے ہیں۔ مگر وہ یہ بات نہیں جانتا کہ حشر کا ہنگامہ بپا ہونے کو ہے۔ اصل سکون وہ ہے جو اس روز حاصل ہو جائے۔ کیونکہ اس کے بعد انسان کی زندگی میں کوئی غم، دکھ، پچھتاوا نہیں آئے گا۔ اس روز یہ سکون صرف اسی شخص کو ملے گا جس نے بن دیکھے خدا کو مانا، بن چھوئے اسے محسوس کیا، بن سنے اس سے کلام کا شرف حاصل کر لیا۔ یہ مقصد صرف قرآن مجید اور نبی کریم کی رہنمائی اور قرآن کے پیغام بندگی کے راستے پر چلنے سے حاصل ہوتا ہے۔ خدا پرستی کے اس شعور اور بندگی کی راہ پر چل کر

اخروی زندگی میں نعمت واطمینان کا حصول ہی بندۂ مومن کی زندگی کا مقصد ہونا چاہیے۔

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اِس دنیا کا سارا سکون بھی اسی راستے میں پوشیدہ ہے۔انسان کی روح، اس کی انا، اس کے جذبات، اس کی ضروریات، اس کی خواہشات کی یکساں تسکین اگر اس دنیا میں کسی راستے پر چل کر مل سکتی ہے تو وہ یہی بندگی کا راستہ ہے۔ یہی راستہ انسان کے قلب کو قلبِ سلیم بناتا ہے، (شعرا 89:26، صافات 84:37)۔ یہ قلب سلیم علم واخلاق اور سیرت وشخصیت کی ہر کمزوری اور بیماری سے پاک وہ قلب ہوتا ہے جو دنیا میں خدا کی یاد سے سکون پاتا (رعد 28:13) اور آخرت میں نفس مطمئنہ (فجر 27:89) بن کر ہر غم وفکر سے ابدی طور پر آزاد ہو جاتا ہے۔

ان دیکھی چیزوں کو دیکھ لینا عقل انسانی کا خاص وصف ہے۔ جو شخص اپنے عقل وشعور کو اتنا بلند کر لے کہ ان دیکھے خدا کو دیکھ سکے، وہی ربانی انسان اور وہی اللہ کا سچا بندہ ہے۔ وہی اس بات کا حق دار ہے کہ دنیا وآخرت کا سکون اس کی جھولی میں ڈال دیا جائے۔

الطاف احمد اعظمی

قرآن کی وجہ تسمیہ

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

خدا کی طرف سے جو کتابیں انسانوں کی رشد و ہدایت کے لیے مختلف زمانوں میں بھیجی گئیں ان کا کوئی نہ کوئی نام یقیناً رہا ہوگا۔ لیکن آج یہ معلوم کرنا ناممکن ہے کہ وہ نام کیا تھے۔ جن مذہبی کتابوں کے نام محفوظ رہ گئے ہیں ان میں تورات، زبور اور انجیل ہیں جو بالترتیب حضرت موسیٰ، حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کو دی گئی تھیں۔ ان کتابوں کے یہ نام قرآن میں آئے ہیں۔ تورات کے معنی کتاب یعنی شریعت، زبور کے معنی مناجات اور انجیل کے معنی بشارت کے ہیں۔ یہ نام ان کی معنوی خصوصیات کو ظاہر کرتے ہیں۔ تورات میں شرائع کا ذکر ہے، انجیل میں آخری رسول کی آمد کی بشارت دی گئی ہے اور زبور میں خدا کی حمد پر مشتمل نغمات ہیں۔ حضرت داؤد بڑے خوش الحان تھے۔ جب زبور کی تلاوت کرتے تو ان کے دلی جوش، جذبۂ صادق اور خوش آوازی کی وجہ سے شجر و حجر اور پرندے تک وجد کرنے لگتے تھے۔ (سورۂ سبا ۱۰)

ان آسمانی صحائف کی طرح آخری صحیفۂ ہدایت کا بھی نام رکھا گیا اور وہ قرآن ہے۔ بہت سے اہلِ علم کا خیال ہے کہ ابتدا میں اس کتاب کا نام کچھ اور تھا۔ روایت ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق نے قرآن مجید جمع کرایا تو اس کے نام کے بارے میں صحابہ سے مشورہ کیا۔ کسی نے کہا کہ اس کے پاروں کو انجیل کہا جائے، لیکن اس رائے کو پسند نہیں کیا گیا۔ کسی نے کہا کہ اس کو یہود کے سِفر ہائے پنجگانہ کی طرح سِفر کہا جائے۔ یہ بات بھی قابلِ قبول نہ ٹھہری۔ آخر کار عبداللہ ابن مسعودؓ نے کہا کہ حبشہ کی مہاجرت کے زمانے میں، میں نے ایک کتاب دیکھی جس کا نام مصحف

۱؎ کتب ساویہ کے لیے قرآن مجید میں جو مشترک لفظ استعمال ہوا ہے وہ 'صحف' ہے جو صحیفہ کی جمع ہے، مثلاً صحفِ ابراہیم وموسیٰ

تھا۔اس خیال کوسب نے پسند کیااور قرآن مجید کا نام مصحف[1] رکھ دیا گیا[2]۔

اگر چہ اس روایت کی اسناد منقطع ہیں لیکن اس مضمون کی دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعِ قرآن سے پہلے اس کا کوئی نام نہیں تھا۔ مجموعۂ وحی متفرق سورتوں کی شکل میں تھا اور جب ان کو جمع کیا گیا تو اس کا نام مصحف رکھا گیا[3]۔ راقم کو اس خیال سے اتفاق نہیں ہے۔ قرآن میں اس امر کے شواہد کثرت سے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا نام شروع سے قرآن تھا۔ اس سلسلہ میں درج ذیل آیات حجّتِ قطعی کی حیثیت رکھتی ہیں:

(۱) شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ. (سورۂ بقرہ:۱۸۵)

(۲) وَعۡدًا عَلَیۡهِ حَقًّا فِی التَّوۡرٰىةِ وَالۡاِنۡجِیۡلِ وَالۡقُرۡاٰنِ. (توبہ:۱۱۱)

(۳) قُلۡ لَّئِنِ اجۡتَمَعَتِ الۡاِنۡسُ وَالۡجِنُّ. (اسرائیل:۸۸)

(۴) اَفَلَا یَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ اَمۡ عَلٰی قُلُوۡبٍ اَقۡفَالُهَا. (سورۂ محمد:۲۴)

(۵) فَقَالُوۡۤا اِنَّا سَمِعۡنَا قُرۡاٰنًا عَجَبًا. (سورۂ جن:۱)

(۶) فَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. (سورۂ نحل:۹۸)

(۷) یٰسٓ وَالۡقُرۡاٰنِ الۡحَکِیۡمِ. (سورہ یٰسین:۱،۲)

(۸) فَاقۡرَءُوۡا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ. (سورۂ مزمل:۲۰)

(النجم:۳۶)، صحفِ اولیٰ (طٰہٰ:۱۳۳)، صحف مکرّمہ (عبس:۱۳)، صحفِ مطہّرہ (سورۂ بیّنہ:۲) اور صحف منشرہ (مدثر:۵۲)۔ صحیفہ اس چیز کو کہتے ہیں جو پھیلی اور کشادہ ہو۔ اسی لیے صفحہ کو بھی جس پر لکھا جاتا ہے، صحیفہ کہتے ہیں۔ نامہ کو بھی صحیفہ کہا جاتا ہے (سنن ابی داؤد، باب الزکٰوۃ، ومسند ابن حنبل ۴/۱۸۱)۔ مجموعہ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، چنانچہ حضرت ابوہریرہ کے مجموعۂ حدیث کو جسے ہمام بن منبہ (متوفی ۱۰۱ھ) نے نقل کیا ہے، صحیفۂ ابوہریرہ کہا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ لکھے ہوئے صحائف کے مجموعہ کو جو دو جلدوں میں ہو مصحف کہا جاتا ہے اور اس کی جمع مصاحف ہے۔ لیکن بعض اہل علم کی رائے میں مصحف اور صحیفہ ہم معنی ہیں، یعنی لکھی ہوئی چیزوں کے مجموعہ کو مصحف یا صحیفہ کہا جاتا ہے۔ شعرائے جاہلیت نے اپنے کلام میں اسفارِ نصاریٰ کو مصاحف کے نام سے موسوم کیا ہے۔ مثلاً امرأالقیس کہتا ہے:

اتت حجج بعدی علیہ فاصبحت   کخط زبور فی مصاحف رہبان

۲؎ الاتقان فی علوم القرآن، امام جلال الدین سیوطی، ج۱، ص۱۸۴، وتاریخ الرسل والملوک، طبری، ص۱۹۱۹

۳؎ تفسیر طبری (جامع البیان)، محمد بن جریر طبری، ج۱، ص۲۰، مزید دیکھیں، بخاری (فضائل القرآن)

یہ نام یعنی قرآن، نہ صرف اہلِ ایمان کے درمیان معروف تھا بلکہ کفار مکہ بھی اس کو اسی نام سے جانتے تھے جیسا کہ اس آیت سے بالکل واضح ہے:

قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ ھٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ. (سورۂ یونس:۱۵)

''وہ لوگ جو ہم سے ملاقات کی امید نہیں رکھتے (تم سے) کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ کوئی قرآن لاؤ یا اس میں تبدیلی کرو۔''

ان آیات کی موجودگی میں ایک لمحہ کے لیے بھی یہ گمان مشکل ہے کہ جمعِ وحی کے وقت اس کے نام کے متعلق صحابہ کے درمیان کوئی اختلاف واقع ہوا تھا۔ مذکورہ روایت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا نام مصحف اس کی سورتوں کی جمع وترتیب کے اعتبار سے رکھا گیا تھا۔ چنانچہ جب حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں قرآن کو دوبارہ جمع کیا گیا اور اس کی نقلیں تیار کرا کے ممالکِ مفتوحہ میں بھیجی گئیں تو اس کا نام 'مصاحفِ عثمانی' پڑ گیا۔ اس کے علاوہ جن صحابہ نے ذاتی طور پر اپنی تلاوت کے لیے اس کو لکھا اور اپنے پاس رکھا ان کے نسخوں کا نام بھی ان کے نام کی طرف منسوب ہو کر مصحف کہلایا، مثلاً مصحفِ ابی بن کعب وغیرہ۔

لیکن روایت کرنے والے نے اس کو اس طرح بیان کیا گویا جمعِ قرآن سے پہلے اس کا کوئی نام ہی نہ تھا۔ بہرحال اوپر کی گفتگو سے معلوم ہو گیا کہ آخری صحیفۂ ہدایت کا نام ابتدا سے قرآن تھا اور یہی اس کا اصلی نام ہے۔

مادۂ اشتقاق اور لغوی معنی

جہاں تک قرآن کے مادۂ اشتقاق اور اس کے لغوی معنی کا تعلق ہے، اس کے بارے میں بہت پہلے سے اختلاف چلا آ رہا ہے۔ عبداللہ ابن عباسؓ (م ۶۸ھ) کا ایک قول ہے کہ قرآن 'رجحان' کے وزن پر قرأت (قرء یقرء) سے مصدر ہے، پڑھنے کے معنی میں۔ اور دوسرا قول ہے کہ اسم ہے، یعنی وہ چیز جو پڑھی جائے (مایقرأ)۔

قتادہ جو تابعین کے طبقۂ دوم سے تعلق رکھتے ہیں، ان کا قول ہے کہ قرآن مصدر ہے قَرءَ سے (باب نصر وفتح)، جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔ عرب جب کسی چیز کو یکجا کرتے اور ایک حصے کو دوسرے حصے کے ساتھ ملا کر اس میں مقداری اضافہ کرتے تو کہتے تھے: قرأت الشیٔ قرآنا ''میں نے اس میں کچھ اضافہ کیا۔ عمر بن کلثوم تغلبی (م ۴۰ ق ھ) جو عہد جاہلی کا ایک مشہور شاعر ہے، اپنے معلقہ میں کہتا ہے:

ذراعیْ عیطلٍ إدماءَ بکرٍ هِجان اللّون لم تقرأ جنینا

''میرے دونوں بازو خوبصورت اور سفید ہیں، اس جوان اونٹنی کے دست و بازو کی طرح جس نے ابھی تک (اپنے رحم میں) کسی جنین کو جمع نہیں کیا ہے (یعنی اس نے ابھی تک کوئی بچہ جنا نہیں ہے، خوب فربہ ہے)۔''

لیکن اکثر علما اور مفسرین نے ابن عباسؓ کے پہلے قول کو ترجیح دی ہے، یعنی قرآن بمعنی قرأت ہے۔ اس سلسلے میں علما لغت اور فقہاء و متکلّمین نے جو کچھ لکھا ہے اس کو مختصراً یہاں لکھا جاتا ہے۔

زجّاج (م ۳۱۱ھ) نے لکھا ہے کہ قرآن مہموز ہے اور 'فعلان' کے وزن پر (مثل غفران) القَرء سے مشتق ہے اور اس کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں: قُرء الماءُ فی الحوض ''حوض میں پانی جمع ہو گیا۔'' جوہری (م ۳۹۳ھ) اور اس سے پہلے سفیان بن عینیہ (م ۱۹۸ھ) نے بھی قرآن کے یہی معنی بیان کیے ہیں[4]۔

لحیانی (م ۲۱۵ھ) نے لکھا ہے کہ قرآن مصدر مہموزی ہے، رجحان اور غفران کے وزن پر اور 'قرء' سے مشتق ہے، بمعنی 'تلا' یعنی پڑھنا۔ چوں کہ مفعول کو مصدر بھی کہہ دیتے ہیں، مثلاً مکتوب کو جو لکھا ہوتا ہے کتاب کہا جاتا ہے، اسی طرح 'مقروء' سے قرآن ہو گیا[5]۔

فراء (م ۲۰۷ھ) کا قول ہے کہ قرآن قرائن سے جو قرینہ کی جمع ہے، مشتق ہے، اس لیے کہ ایک پارہ کی آیات دوسرے پارہ کی آیات سے مشابہت رکھتی ہیں۔ اور یہ لفظ دراصل بغیر ہمزہ کے ہے۔ قرطبی (م ۶۷۱ھ) اس قول کے حامی ہیں لیکن زجاج اور ابو علی فارسی (م ۳۷۷ھ) اس قول کے منکر ہیں۔

بعض دوسرے علما لغت نے بھی اسے بغیر ہمزہ کے مانا ہے لیکن اسے 'قری' سے مشتق بتایا ہے، بمعنی ضیافت و مہمانی، یعنی قرآن اللہ تعالیٰ کا بچھا ہوا خوانِ نعمت ہے کہ ہر شخص بقدر ظرف و استعداد اس سے بہرہ مند ہو۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: انّ ھذا القرآن مائدۃ فخذوا منہ ''یہ قرآن ایک بچھا ہوا دستر خوان ہے، اسے لے لو''[6]۔

خطیب بغدادی (م ۴۶۳ھ) نے لکھا ہے کہ امام شافعی (م ۲۰۴ھ) اسماعیل بن قسطنطین (معروف بہ قسط) سے قرآن پڑھتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ لفظ قرآن اسم ہے، مہموز نہیں، یعنی یہ قرأت سے مشتق نہیں ہے۔ اگر قرأت سے مشتق ہوتا تو جو کچھ پڑھا جا چکا ہوتا وہی

---

[4] البرہان فی علوم القرآن، علامہ بدرالدین زرکشی، ج ۱، ص ۲۷۷، والاتقان فی علوم القرآن، ج ۱، ص ۵۱

[5] تفسیر طبری، ج ۱، ص ۳۳

[6] سنن دارمی (فضائل القرآن)، ص ۱

[7] تاریخ بغداد، خطیب بغدادی، ج ۲، ص ۶۲، البرہان فی علوم القرآن، ج ۱، ص ۲۷۸، الاتقان فی علوم القرآن، ج ۱، ص ۵۱

قرآن کہلاتا۔ امام بیہقی (م ۴۵۸ھ) نے بھی لکھا ہے کہ امام شافعی قرآن کو اسمِ غیر مہموز قرار دیتے تھے، یعنی یہ کسی لفظ سے مشتق نہیں، بلکہ کلام الٰہی کا ایک خاص نام ہے۔ علامہ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) اور امام جلال الدین سیوطیؒ (م ۹۱۱ھ) اسی خیال کو درست سمجھتے تھے[7]۔

امام اشعری (۳۲۴ھ) اور ان کے متبعین کا کہنا ہے کہ لفظ قرآن 'قـــرن' سے مشتق ہے۔ عرب جب کسی چیز کو دوسری چیز کے ساتھ جوڑتے تھے یعنی ضمیمہ کرتے تھے تو کہتے تھے: قرنت الشئ بالشئ۔ اس لحاظ سے سورتوں اور ان آیات کی جمع و تالیف کو بھی قرآن کہتے ہیں، بالفاظ دیگر جب آیات قرآن کو ایک دوسرے کے ساتھ مقرون کرتے ہیں تو اس کے مجموعہ یا اس کے اجزاء کو قرآن کہتے ہیں[8]۔ اس میں نون لفظ کے اصلی حروف کا جزء ہو گا اور ہمزہ ممدودہ زائدہ۔ اس صورت میں قرآن کا تلفظ بغیر ہمزہ کے کیا جائے گا[9]۔

قرآن میں اس لفظ کے استعمالات

قرآن کی مختلف سورتوں میں یہ نام یعنی قرآن نحوی اعتبار سے ۶۸ مرتبہ آیا ہے، پچاس بار بصورت معرفہ یعنی الف لام تعریف کے ساتھ اور سولہ بار بغیر تعریف کے۔ ان مقامات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا مادہ 'قـــرء' ہے جس کے اصل معنی تو جمع کرنے کے ہیں لیکن ثانوی معنی پڑھنے کے ہیں۔ پڑھنے کا عمل دراصل حروف و کلمات اور جملوں کو جمع کرنے کا عمل ہے۔ ان کو ایک دوسرے سے ملائے بغیر پڑھا نہیں جا سکتا ہے۔ اسی ثانوی معنی میں فرمایا گیا ہے: اَقِمِ الصّلوٰة لدلوكِ الشمس الىٰ غسقِ الّيل و قراٰن الفجران قراٰن الفجر كان مشهودا. (بنی اسرائیل ۱۷: ۷۸) ''نماز قائم کرو زوالِ آفتاب کے وقت سے لے کر شب کے تاریک ہونے تک اور خاص کر فجر کی قرأت کا (اہتمام کرو)، بے شک فجر کی قرأت میں (دل و دماغ کی) حضوری ہوتی ہے'' اسی معنی میں حسان بن ثابتؓ کی طرف یہ شعر منسوب ہے:

۸؎ قرآن، مقارنت اور وصل کے معنی میں ہے۔ جس وقت دو ستارے ایک برج میں جمع ہو جاتے ہیں تو اس اجتماع کو علم النجوم کی اصطلاح میں قران کہا جاتا ہے۔ فقہ میں حج و عمرہ کو ایک ساتھ جمع کرنے کو حجِّ قران کہتے ہیں۔ اسی طرح نماز میں سورۂ فاتحہ کے بعد کسی دوسری سورہ کے ملانے کو بھی قران کہا جاتا ہے۔

۹؎ تفصیل کے لیے دیکھیں، تاریخ قرآن، ڈاکٹر محمود رامیار، ص ۹ تا ۲۰

ضحوا بأشمط عنوان السجود بہ   یقطع اللیل تسبیحا و قرآنا

اس شعر میں واضح طور پر قرآن کو پڑھنے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن ''قرء'' کے اصلی معنی جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، جمع وتالیف کے ہیں۔ متعدد علماءِ لغت ونحو کے اقوال سے جیسا کہ پہلے بیان ہوا، اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ اس بارے میں قرآن کی ایک آیت بڑی اہمیت رکھتی ہے جس میں جمع وقرآن کے الفاظ ایک ساتھ استعمال کیے گئے ہیں، فرمایا ہے:

لَاتُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ. اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ. فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ. ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ. (سورۂ قیامہ:۱۶-۱۹)

عام طور پر علماء ومفسرین نے اس آیت کے فقرہ 'جمعه' میں جمع سے ایک سورہ میں آیتوں کو جمع کرنا مراد لیا ہے[۱۰]، لیکن راقم کو اس سے اختلاف ہے۔ اس آیت کا پہلا فقرہ ''لا تحرك به لسانك لتعجل به'' بتاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نزول وحی کے وقت اپنی زبان کو اس لیے جلدی جلدی گردش دیتے تھے کہ اسے یاد کرلیں، اس وحی کو ان کے سینے میں جمع کردینا ہماری ذمہ داری ہے، پھر وہ اس کو کبھی نہیں بھولیں گے۔ چنانچہ ایک دوسری جگہ فرمایا گیا ہے: سنقرئك فلا تنسیٰ. الا ماشاء اللّٰه.

(سورۂ اعلیٰ:۶)

اسی طرح اکثر علماء نے 'قرانه' میں قرآن کو پڑھنے کو معنی میں لیا ہے، جس کی وجہ غالباً سورۂ بنی اسرئیل کی آیت ۷۸ ہے جس میں یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے اور اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بھی یہی معنی لکھے ہیں:[۱۱]

وقرانہ یعنی توفیق دہیم قرآءِ امت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم را وعوام ایشان را بر تلاوت آن تا سلسلۂ تواتر از ہم گسستہ نشود، خدائے تعالیٰ می فرمایند کہ در فکر مباش کہ قرآن از دل تو فراموش شود ومشقت تکرار آن مکش[۱۲]

---

[۱۰] شاہ صاحب نے لکھا ہے: ان علینا جمعہ آن ست کہ لازم است وعدۂ جمع کردن قرآن بر ما در مصاحف، ''ان علینا جمعه کے معنی یہ ہیں کہ مصاحف میں قرآن کو جمع کرنے کا وعدہ ہم پر لازم ہے۔'' (ازالۃ الخفاء، ج۱، ص۳۹)

[۱۱] ازالۃ الخفاء، ج۱، ص۳۹

[۱۲] اس اقتباس کے آخری دو جملوں کا تعلق دراصل 'ان علینا جمعه' سے ہے جسے شاہ صاحب نے 'قرانہ' سے جوڑ دیا ہے جو ظاہر ہے کہ صحیح نہیں ہے۔

''اور 'قرانہ' کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی امت کے قاریوں اور عام لوگوں کو اس کی تلاوت کی توفیق عطا کریں گے تاکہ سلسلۂ تواتر ٹوٹنے نہ پائے۔ اور خدا تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم اس کی ذرا بھی فکر نہ کرو کہ قرآن تمہارے دل سے فراموش ہو جائے گا۔ اس لیے اس کی تکرار کی مشقت نہ اٹھاؤ''

'قرانہ' کی یہ تشریح محلِ نظر ہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ قرآن کی آیات مختلف اوقات میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کی گئی تھیں۔ ان متفرق آیات کو ایک سلسلۂ نظم میں پرونا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ اسی مسئلہ کے حل کے لیے 'قرانہٗ' کا فقرہ آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ متفرق آیات کو ایک سورہ میں ایک خاص نظم و ترتیب سے اکٹھا کر دینا کہ کہیں سے کوئی ادنیٰ معنوی خلل واقع نہ ہو، خدا کی ذمہ داری ہے۔ اس کے بعد فرمایا: ثم اِنَّ علینا بیانہ ''پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی وضاحت''، یعنی صرف متن کی حفاظت ہی اللہ کی ذمہ داری نہیں بلکہ اس کے معنی کی وضاحت و تفصیل کر کے اس کو معنوی تحریف سے محفوظ رکھنا بھی اس کی ذمہ داری میں داخل تھا۔ الحمد للہ، یہ تینوں وعدے اس طرح پورے ہوئے کہ آج دنیا اس کو دیکھ کر انگشت بدنداں ہے۔

تاریخ کی شہادت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام اُمّتیوں کی طرح قرآن مجید کو حفظ کرنے کی مشقت نہیں اٹھائی۔ ادھر جبرئیلؑ نے وحی سنائی اور ادھر وہ لوح حافظہ پر نقش کالحجر ہوگئی۔ پھر جبرئیل علیہ السلام کی ہدایت کے مطابق متفرق آیات کو سورتوں کے اندر اس درجہ منظّم صورت میں رکھا گیا کہ کہیں سے کوئی معنوی بے ربطی پیدا نہیں ہوئی۔

تیسرا وعدہ یعنی 'ان علینا بیانہ' اس طرح پورا ہوا کہ آج قرآن دنیا کی واحد مذہبی کتاب ہے جو اپنے متن کی خود شارح ہے۔ اس میں دین کے اساسی موضوعات سے متعلق مجمل آیات کی تفصیل اور مشکل مضامین کی توضیح اور تشریح طلب الفاظ کی معنوی شرح کا عجیب وغریب اہتمام کیا گیا ہے۔ لیکن متن اور شرح کے اختلاط کے باوجود نظم کلام میں کہیں بھی کسی نوع کا انتشار پیدا نہیں ہوا ہے اور یہ بلاشبہ قرآن کا اعجاز بلکہ بہت بڑا اعجاز ہے۔

'جمعہ و قرانہ' کی اس معنوی وضاحت کے مطابق سورۂ قیامہ کی زیرِ بحث آیات کا صحیح مفہوم یہ ہوگا کہ

''اے نبی تم وحی کو یاد کرنے کی غرض سے اپنی زبان کو جلدی جلدی گردش نہ دو، اس کو جمع کرنا (یعنی تمہارے سینے میں اس کو جمع کرنا، یاد کرا دینا) اور اس کی ترتیب و تالیف (یعنی متفرق آیات کو ایک سورہ کے اندر حکیمانہ طور پر مرتب کر دینا) ہمارے ذمہ ہے۔ پس جب ہم اس کو ایک ترتیب سے اکٹھا کر دیں تو تم اس جمع و ترتیب کی پیروی کرو، (یعنی اسی کے مطابق اس کی تلاوت کرو اور مومنین بھی کہ اس کی تلاوت کریں اور اس کو حفظ کریں)، اور ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی تفصیل و وضاحت۔''

قرآن کے مادۂ اشتقاق کی مذکورہ بالا تفصیلی بحث کی روشنی میں ہم اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آخری صحیفۂ ہدایت کا نام قرآن اس لیے رکھا گیا کہ اس کے اندر حروف وکلمات، آیات اور سورتیں ایک خاص نظم وترتیب کے ساتھ جمع ہیں۔ اس کے علاوہ گزشتہ آسمانی صحیفوں کے اندر جو خدائی احکام اور حقائق ومعارف پراگندہ یا محرف حالت میں تھے یا جن کو ان کے حاملین نے بھلا دیا تھا، ان سب کو اس آخری مجموعۂ ہدایت کے اندر محفوظ کر دیا گیا ہے۔ (مائدہ۔ ۴۸)۔ اس کے علاوہ آیندہ نسل انسانی کو جو ضروری ہدایات درکار تھی وہ بھی اس میں فراہم کر دی گئی ہیں۔

اس پہلو سے دیکھیں تو اس کتاب کا نام ہی اس کے اعجاز کی دلیل ہے۔ آیات کا مختلف اوقات میں نجماً نجماً نازل ہونا اور پھر ان کو ترتیب نزولی کا لحاظ کیے بغیر ایک سورہ کے اندر اس طرح رکھ دینا کہ ہر آیت دوسری آیت سے گہری معنوی مناسبت رکھتی ہو، کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ اس کے علاوہ گزشتہ تمام مذہبی صحیفوں کی بنیادی تعلیمات کو پوری صحت کے ساتھ اس کے اندر محفوظ کرنا بھی انسانی قدرت سے خارج ہے۔ اور ایک اُمی انسان سے تو اس کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی۔

ترتیب
محمد بلال

متفرق سوالات

[''یہ ان سوالوں کے جوابات ہیں جو غامدی صاحب نے ''دنیا'' ٹیلی وژن کے پروگرام ''دین و دانش'' میں دیے ہیں۔ انھیں محمد بلال نے ضروری ترمیم و اضافہ کے ساتھ مرتب کیا ہے۔'']

مذہب کی ضرورت؟

سوال: انسان کو مذہب کی ضرورت کیوں ہے اور یہ انسان کی شخصیت یا اس کے نفس سے کیسے متعلق ہوتا ہے؟

جواب: دنیا میں جب بھی آپ کسی چیز کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو اس کو انسانی زندگی کے تناظر میں دیکھنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر، اگر یہ سوال کیا جائے کہ طب کیوں ہے؟ تو یقیناً اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ چونکہ انسان ہمیشہ ایک حالت میں نہیں رہتا، اس کو مختلف بیماریاں لاحق ہوتی ہیں، اس لیے انسان کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ ان کا علاج دریافت کرے، بیماریوں کی نوعیت جاننے کی کوشش کرے، یہ جاننے کی کوشش کرے کہ بیماریاں کیوں لاحق ہوتی ہیں اور کیا وہ ان سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ یہی معاملہ تمام علوم و فنون کا ہے۔ اگر آپ تفریحات کی چیزوں کو الگ کر دیں تو جتنے بھی علوم و فنون ہیں وہ انسانی ضرورتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر آپ جمالیات کے پہلو سے بھی فنون لطیفہ کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو احساس کی شدت سے بھی نوازا ہے اور صرف احساس کی شدت ہی سے نہیں نوازا، بلکہ وہ اس کے جمالیاتی اظہار سے تسکین بھی حاصل کرتا ہے۔ اس لیے فنون لطیفہ، موسیقی، مصوری، شاعری اور اس طرح کی بہت سی چیزیں وجود میں آ جاتی ہیں۔ انسان کو جس طرح اپنی صحت اور اپنے جمالیاتی احساسات کی تسکین کے مسائل درپیش ہیں، بالکل اسی طریقے سے موت بھی انسان کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ انسان دنیا میں اپنی خواہشوں، امنگوں اور تمناؤں میں جی رہا ہوتا ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ

ساری دنیا کو اپنی گرفت میں لے لے، وہ ارسطو اور افلاطون ہوتا ہے، زندگی کے منصوبے بناتا ہے، جوانی اور شباب کے مزے لوٹ رہا ہوتا ہے۔ یک بہ یک موت کا فرشتہ آتا ہے اور ہر چیز ختم ہو جاتی ہے۔

موت کیوں آتی ہے؟ کیا اس سے انسانی زندگی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جاتا ہے؟ موت کے بعد کیا ہونے والا ہے؟ ہم وہاں کس صورت حال سے دوچار ہوں گے؟ مر کر مٹی ہو جائیں گے یا اٹھائے جائیں گے؟ کوئی نئی زندگی شروع ہوگی یا یہی زندگی ہمارا خاتمہ ہے؟ اگر نئی زندگی شروع ہوگی تو اس کے اصول وقوانین کیا ہیں اور اس نئی زندگی میں جانے کے لیے کیا ہمیں اس دنیا میں کیا کچھ کرنا ہے؟ زندگی بھی اسی طرح مختصر اور فانی ہے یا ابدی ہے؟ اگر ابدی ہے تو اس کا اس کے ساتھ رشتہ کیا ہے؟ یہ وہ اہم ترین سوالات ہیں جن کا جواب فلسفے نے بھی دینے کی کوشش کی ہے، پھر ابتدا میں سائنس نے بھی دینے کی کوشش کی، لیکن اس وقت انسان کی کم وبیش پانچ ہزار سال کی علمی تاریخ بتاتی ہے کہ ان علوم میں سے کوئی ایک چیز بھی ان سوالات کا معقول جواب نہیں دے سکی۔ اب تک کی دنیا میں ان سوالات کا سب سے زیادہ معقول، فطری، عقلی اور سائنٹیفک جواب صرف مذہب نے دیا ہے۔ اس لیے مذہب انسان کے سب سے بڑے مسئلے کا حل ہے اور اس کی ضرورت ہے۔

موت کا سبب اور اس کے بعد کے احوال کا علم

سوال: موت کا سبب اور اس کے بعد ہونے والے احوال وواقعات کے بارے میں جاننا صرف سوچنے سمجھنے والے انسان کا مسئلہ ہے یا یہ عام آدمی کا بھی مسئلہ ہے کہ وہ ان کے جوابات تلاش کرنے کے لیے تگ ودو کرے؟

جواب: اس معاملے میں عام اور خاص کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ یہ ہمیں صرف اس لیے محسوس ہوتا ہے کہ عام آدمی اس کے کسی نہ کسی جواب پر مطمئن ہو چکا ہوتا ہے۔ اگر اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہ ہو تو یہ سارے سوال وہاں بھی اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس کا تعلق کسی عالم اور فاضل سے نہیں اور نہ کسی فلسفی اور حکیم سے ہے۔

کیا خوف مذہب کی ابتدا ہے؟

سوال: مذہب کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ خوف سے پیدا ہوا۔ یعنی زلزلے آتے تھے، آفات آتی تھیں۔ ابتدا میں انسان کمزور تھا، اس کے پاس نہ تہذیب تھی، نہ رہن سہن تھا اور نہ ٹیکنالوجی۔ اب چونکہ انسان نے ان چیزوں پر عبور حاصل کر لیا ہے، لہٰذا مذہب کی اب کوئی ضرورت نہیں۔ کیا یہ بات درست ہے؟

جواب: یہ بات دور جدید کے ماہرین نفسیات نے کہی تھی۔ لیکن اگر اس کے اندر اتر کر اس کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ بات منطقی استدلال کی میزان میں پوری نہیں اترتی۔ آپ کو خوف اسی وقت لاحق ہو گا جب آپ کو کچھ چیزیں عزیز و محبوب ہوں گی۔ انسان کو جو خوف لاحق ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ محبت کے مواقع پہلے موجود تھے۔ انسان کو زندگی عزیز تھی، زندگی کا رہن سہن عزیز تھا، وہ اپنی دنیا سے محبت کرتا تھا۔ اسی لیے تو اسے یہ خوف لاحق ہوا کہ زلزلہ مجھ سے یہ سب کچھ چھین لیتا ہے۔ طوفان آتا ہے اور میری کٹیا کو بہا لے جاتا ہے، آندھی آتی ہے اور میرا سب کچھ برباد کر جاتی ہے۔ یہ سب کچھ جو اس کے پاس ہے، اس سے اس کو جو محبت محسوس ہوئی یا ہونی چاہیے تھی وہی اصل میں خوف کا باعث بنے گی۔ خوف کبھی مقدم نہیں ہوتا۔ انسان کا مقدم ترین جذبہ محبت کا جذبہ ہے۔ جب اس طرح کی تصویر کھینچی جاتی ہے تو اس بات کو بھلا دیا جاتا ہے کہ کیا ہمیشہ زلزلے اور طوفان ہی آتے ہیں؟ انسان کی نگاہ ان پہاڑوں، دریاؤں، تلاطم خیز موجوں اور گردوپیش کی عطر بیز ہوا پر کبھی نہیں گئی؟ انسان نے اپنے گردوپیش کی خوب صورتی اور اپنے وجود کے حسن کو کبھی نہیں دیکھا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حسن و خوبی سے کوئی محبت پیدا نہ ہوئی ہو اور خوف کا جذبہ سب سے پہلے آ گیا ہو۔ اس لیے یہ بات کہ مذہب خوف سے پیدا ہوا ہے، ٹھیک نہیں ہے۔

مذہب اور ضعیف الاعتقادی

سوال: مذہب کے بارے میں عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ اس پر ایمان ایک اندھا عقیدہ ہے، کیا عقلی طور پر اس کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے اور یہ لوگوں کو عموماً ضعیف الاعتقاد کیوں بنا دیتا ہے؟

جواب: اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ انسان کے ہاں اوہام کی صورت میں جو مذہبی اعتقادات ہیں، یہ کیسے پیدا ہوئے؟ یہ سب کے سب انسان کی ضعیف الاعتقادی سے پیدا ہوئے ہیں۔ کوئی بیماری آ گئی، مصیبت آ گئی، انسان کے اوپر کوئی حادثہ ٹوٹ پڑا۔ اس موقع پر انسان کمزور ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں اس کی شخصیت کا جو غیر معمولی توازن ہے، وہ مجروح ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی خواہشات سے مغلوب ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ وہ موقع ہے جب اوہام پر مبنی مذاہب پیدا ہوتے ہیں۔ یہ اصل میں مشرکانہ مذاہب ہیں۔ جس میں کسی دیوی دیوتا یا سورج چاند کو معبود بنا لیا گیا ہے۔ فطرت کی قوتوں کی پرستش کے جو احساسات اور جذبات انسان کے اندر پیدا ہوئے ہیں، یہ توحید کے تصور سے انحراف کے نتیجے میں آئے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت آج سے چودہ، پندرہ سو سال قبل ہوئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے توحید

کی دعوت دی۔ قرآن مجید بھی توحید کی دعوت دیتا ہے۔لیکن اس کے باوجود یہ ضعیف الاعتقادی مشرکانہ عقائد کے پیدا کرنے کا باعث بن گئی۔ یہی معاملہ اس سے پہلے کا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے جس مذہب کی ابتدا ہوئی وہ اسلام تھا، توحید تھی، ایک خدا پر ایمان تھا، لیکن بعد کے مراحل میں جب انسان اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے تھوڑے فاصلے پر ہوا تو اس کے نتیجے میں وہی ضعیف الاعتقادی غالب آ گئی۔ اس وقت ہمارے پاس قرآن موجود ہے، احادیث موجود ہیں، توحید پر ایمان کی ایک عظیم روایت موجود ہے۔ اس کے باوجود عام لوگ ہر طرح کے مشرکانہ اوہام میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

انبیا علیہم السلام کی بعثت اسی لیے ہوئی کہ انسان کے ان اعتقادات کے معاملے میں اسے متنبہ کیا جائے، وہم سے نکالا جائے، اسے توحید کا صحیح شعور دیا جائے اور اسے بلند کر کے پروردگار کے ساتھ متعلق کیا جائے۔ اگر انسان اللہ تعالیٰ کی اس پہلی ہدایت پر قائم رہ جاتا تو پے در پے پیغمبر بھیجنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ قرآن مجید نے یہی بات سورۂ بقرہ میں بیان کی ہے کہ: 'كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً. (البقرہ ۲:۲۱۳)' انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے توحید پر پیدا کیا ہے۔ وہ ایک ہی گروہ تھے، ان کے دین میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ پھر ارشاد ہوا کہ اس کے بعد وہ ان اوہام کا شکار ہوئے۔ 'فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّيْنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ (البقرہ ۲:۲۱۳)' پھر اللہ تعالیٰ نے نبیوں کا سلسلہ جاری کیا جو بشارت دینے اور خبردار کرنے کے لیے آئے۔ قرآن بھی اپنے نزول کا مقصد یہی بیان کرتا ہے کہ لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کر دے۔ دوسری جگہ بیان کیا 'لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (حدید ۵۷:۲۵)' تاکہ دین کے معاملے میں لوگ ٹھیک انصاف پر کھڑے ہو جائیں۔ یعنی انسان کو انحرافات سے نکال کر بالکل اس جگہ پر لے آیا جائے، جو انبیا علیہم السلام نے ان کے لیے متعین کی ہے۔

مذہب کی حقیقت

سوال: مذہب کے بارے میں بعض لوگ کا خیال ہے کہ یہ کچھ اعتقادات، رسوم اور کچھ اعمال سر انجام دینے کا نام ہے، اس کے علاوہ مذہب میں کیا ہے؟ اور اس میں بعض چیزیں جن کو خیر سمجھا جاتا ہے، مثلاً اچھا اخلاق، اچھا رویہ تو یہ کام تو بعض خدا کو نہ ماننے والے لوگ بھی کرتے ہیں۔ لہٰذا مذہب اچھا ہوا یا اخلاق؟ اور دوسری جانب ان رسوم کا کیا فائدہ؟ اگر نماز پڑھنے کے بعد بھی کسی کا اخلاق ٹھیک نہیں ہوتا اور وہ بدعہدی بھی کرتا ہے؟ اس طرح کی چیزیں لوگوں کو Confuse کرتی ہیں۔ مذہب اپنی حقیقت میں کیا ہے؟

جواب: یہ رسوم اور روایات مذہب کا بنیادی مسئلہ نہیں ہے، یہ تو بڑی بعد کی چیزیں ہیں۔ مذہب کا بنیادی مقدمہ یہ ہے کہ تمھیں ایک دن دنیا سے رخصت ہونا ہے اور خدا کے حضور میں پیش ہونا ہے، اس پیشی کے بعد تمھاری ابدی زندگی کی ابتدا ہونی ہے۔ اس زندگی میں اللہ تعالیٰ نے جو فردوس آباد کر رکھا ہے، اس کے لیے وہ اس دنیا کے اندر لوگوں کا انتخاب کر رہا ہے۔ یہ انتخاب جس اصول پر ہو رہا ہے اس کو قرآن کی اصطلاح میں تزکیہ کہتے ہیں۔ یعنی دنیا کے اندر سے، وہ لوگ جو اپنے نفس کا تزکیہ کر لیں، اپنے آپ کو پاکیزہ بنا لیں، ان کا انتخاب کیا جائے۔ دراصل مذہب کا موضوع اخلاقی پاکیزگی ہے۔ اس معاملے میں تین چیزوں کو مذہب نے اپنے دائرے میں لیا ہے۔ ایک یہ کہ ہمارے بدن کو صاف ہونا چاہیے۔ دوسرے ہمارے کھانے پینے کی چیزوں کو پاکیزہ ہونا چاہیے اور تیسرے ہمارے اخلاق کو پاکیزہ ہونا چاہیے۔

یہ مسئلہ اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ لوگوں کو مذہب کی حقیقت سمجھائی نہیں گئی۔ ہم نے اپنی نئی نسلوں کو مذہب کے بارے میں کبھی تعلیم نہیں دی۔ کبھی ان کے سوالات کا جواب نہیں دیا۔ کبھی ان کو جواب دینے کی کوشش نہیں کی۔ اس بات کا کبھی جائزہ لینے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کہاں سے مذہب لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں جب بچہ پیدا ہوتا ہے، والدین اس کو تھوڑی بہت مذہبی معلومات فراہم کر دیتے ہیں۔ ایک قاری صاحب کے سپرد کرتے ہیں۔ قاری صاحب کچھ قرآن پڑھا دیتے ہیں، کچھ دعائیں یاد کرا دیتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ وہ بچہ مسجد میں چلا جائے گا اور وہاں سے کچھ باتیں سن لے گا۔ مذہب کی حقیقی تعلیم علمی اور عقلی استدلال کے ساتھ جس طرح دی جانی چاہیے، وہ ہمارے بچوں کو کبھی دی ہی نہیں جاتی۔ اس وجہ سے یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

مذہب اور انسانی ضرورتیں

سوال: لوگوں کو یہ کیسے بتایا جائے کہ مذہب ان کی کون کون سی ضرورتیں پوری کرتا ہے؟

جواب: یہ بات تعلیم کے ذریعے سے لوگوں کو بتانی چاہیے۔ ہمیں اپنی نئی نسلوں کو بتانا چاہیے، ان کے لیے اس کی تعلیم کے مواقع پیدا کرنے چاہییں۔ اعلیٰ درجے کے اہل علم کو یہ خدمت انجام دینی چاہیے۔ ہم بہت بے چین ہو جاتے ہیں اگر ہم کو معلوم ہو کہ ہمارے ہاں بیماریاں موجود ہیں، لیکن ان کے لیے اعلیٰ درجے کے ہسپتال نہیں ہیں، اعلیٰ درجے کے ڈاکٹر نہیں ہیں۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ طب کی بہترین سہولتیں اپنے ملک میں فراہم کریں۔ لیکن افسوس کہ دین کے علم کے بارے میں ہم کبھی اتنے فکر مند نہیں ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہماری زندگی کا سب

سے بڑا مسئلہ موت کا مسئلہ ہے۔اس کے بعد کیا ہونے والا ہے۔اس پر ہمیں سب سے زیادہ بے تابی، سب سے زیادہ اضطراب ہونا چاہیے تھا، لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔

دین اور فطرت

سوال: دین اگر فطری چیز ہے اور وہ جو کچھ دیتا ہے وہ انسان کی فطرت ہی کی آواز ہوتی ہے تو پھر یہ سوال پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ تعلیم کتنی دی گئی ہے۔اس کو از خود اسے قبول کر لینا چاہیے خواہ وہ ان پڑھ ہو یا کسی تہذیب سے نا آشنا ہو۔کیا یہ نا آشنائی کا مسئلہ ہے یا کچھ اور ہے؟

جواب: یہ معاملہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ گرد و پیش میں مذہب کی غلط تعبیریں ہجوم کر لیتی ہیں یعنی جب آپ غلط باتیں بیان کر دیتے ہیں اور گرد و پیش سے وہ آپ کے سامنے آتی ہیں تو اس کے نتیجے میں انسان ان چیزوں کا شکار ہو جاتا ہے۔اگر اس کو آپ اس کی فطرت پر چھوڑ دیں اور پھر انبیا علیہم السلام کی تعلیم سادگی سے اس کے سامنے آئے تو وہ اسے قبول کرے گا۔

مذہب اور تعلیم

سوال: مذہب کے بارے میں ایک نظریہ یہ ہے کہ یہ اپنی اصل میں بہت سادہ ہے، یہ شخصیت کی تعمیر اور تزکیۂ نفس کا حصول ہے۔جبکہ دوسری طرف مذہب کی یہ تصویر پیش کی جاتی ہے کہ یہ کچھ رسوم اور احکام کا نام ہے۔دنیا میں بہت سارے مذاہب ہیں جن کی اپنی اپنی شناخت ہے، ان کے اپنے اپنے تعصّبات ہیں۔ان دونوں باتوں میں جو فصل ہے اس کو پاٹنے کے لیے آپ کہتے ہیں کہ لوگوں کو تعلیم دی جائے اور ان کا شعور بیدار کیا جائے۔کیا کوئی ایسی تدبیر ہے کہ یہ بنیادی سادہ پیغام لوگوں کو اس بڑے تعلیمی منصوبے کے بغیر سمجھایا جا سکے؟

جواب: اس کے لیے کسی بڑے تعلیمی منصوبے کی ضرورت نہیں ہے۔اس کے لیے یہی کافی ہے کہ ہم اس معاملے میں بیدار اور حساس ہو جائیں۔آج کے دور میں تو یہ بہت آسان ہے۔اللہ تعالیٰ نے بڑے غیر معمولی ذرائع پیدا کر دیے ہیں۔آج سے پچاس سال پہلے اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ آپ ایک کمرے (ٹی وی اسٹوڈیو) میں بیٹھے ہوں گے اور ایک دنیا آپ کی بات سن رہی ہوگی۔ پہلے آپ اگر تعلیم دینا چاہتے تھے تو ایسے غیر معمولی لوگ پیدا کرنے پڑتے تھے جو گاؤں گاؤں جا کے لوگوں کو بتا سکیں۔دنیا میں اعلیٰ درجے کے معلم بہت کم

ہوتے ہیں۔اس میں بھی بڑی مشکلات تھیں۔آج یہ ضرورتیں بھی اللہ تعالیٰ نے پوری کر دی ہیں اور ایسے اسباب فراہم کر دیے ہیں کہ آپ ایک جگہ بیٹھ کر پوری دنیا کو تعلیم دے سکتے ہیں۔اس وجہ سے تعلیم دینا کوئی مشکل کام نہیں، اس کے لیے کسی بڑے منصوبے کی بھی ضرورت نہیں۔صرف ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ ہماری ضرورت ہے۔اس ضمن میں مزید ایک بات واضح رہنی چاہیے کہ جس وقت آپ اپنی قوم کے سامنے اس کو پیش کرتے ہیں تو ایک ایک چیز کے بارے میں بتائیے کہ یہ پہلے سے اپنے ذہن میں کیا سوالات رکھتی ہے۔اس میں ایک عمل ہوتا ہے، جس میں آپ پہلے سے موجود چیزوں کو ڈھا دیتے ہیں۔یہ عمل اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک تنقیدی شعور نہ پیدا کیا جائے۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم تنقید سے ڈرتے ہیں۔یہ تنقید ہی ہے جو اصل میں قوموں کی ترقی کا ذریعہ بنتی ہے۔اگر آپ یہ صلاحیت نہیں رکھتے اور آپ نے یہ چیز پیدا نہیں کی یعنی آپ نے کچھ مقدس رکاوٹیں (Taboos) بنا دی ہیں کہ آپ فلاں چیز کو نہیں چھیڑ سکتے، فلاں پر بات نہیں کر سکتے، تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ صرف ذہنی اور فکری بونے پیدا کریں گے۔آپ کے ہاں وہ لوگ جو آزادی سے بات کرسکیں، بات سمجھا سکیں، سوال کرسکیں، وہ ختم ہونے شروع ہو جائیں گے۔دنیا کے اندر ترقی کرنے کا راستہ یہ ہے۔طب میں بھی بہت غیر معمولی اوہام تھے۔لوگ معلوم نہیں کس کس طریقے سے علاج کرتے تھے۔تعویذ گنڈے تھے، عطائی تھے، لیکن سائنسی طریقۂ کار نے ان سب کو ختم کر دیا۔ مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ یہ جو چیزیں آپ نے بیان کی ہیں اگر ان سب کو تعلیم کے عمل سے گزار دیا جائے تو جو صحیح مذہب اور اس کی اصل حقیقت ہے، وہ ان سب کو بالکل اسی طریقے سے نگل جائے گا، جس طرح قرآن میں بیان ہوا کہ عصاے موسوی ساحروں کی رسیوں کو نگل گیا۔

مذہب اور تقدیر

سوال: اہل مذہب مقدر اور قسمت پر کلی طور پر انحصار کرتے ہیں، کیا اس سے بے عملی پیدا نہیں ہوتی؟

جواب: اس معاملے میں صحیح چیز کو جاننا چاہیے۔کچھ چیزیں ایسی ہیں جو پہلے سے طے ہوتی ہیں مثلاً مجھے کہاں پیدا ہونا تھا، میری شکل وصورت کیا ہوگی، مجھے کیا صلاحیتیں دی جائیں گی۔قدرت کے نظام نے مجھے ایک خاص ملک میں پیدا کر دیا۔اللہ تعالیٰ کی مشیت نے میرے لیے ایک شکل وصورت اور صلاحیتوں کی نوعیت منتخب کر لی۔ان کے بارے میں بھی فیصلہ ہوگیا۔اب اس کے بعد میرا اخلاقی وجود ہے اور ان صلاحیتوں کو نشو ونما دینے کے میدان ہیں، جن میں مجھے اختیار دیا گیا ہے۔ان دونوں چیزوں کو الگ الگ سمجھ لینا چاہیے۔اس کے لیے کسی فلسفی کے پاس

جانے کی ضرورت نہیں۔ ہماری روزمرہ کی زندگی اور ہماری عقل عام اس کا فیصلہ کررہی ہوتی ہے۔ہم جانتے ہیں کہ کون سی چیزیں ایسی ہیں، جوقدرت کے فیصلے کے نتیجے میں ہم کوملی ہیں اورکون سی چیزیں ہیں جن میں ہم کواختیار دیا گیا ہے۔ہم نے کبھی اپنے کسی ملازم کا اس بات پر احتساب نہیں کیا ہے کہ اس کی ناک بڑی اور کان چھوٹے کیوں ہیں۔ یہ چیزیں تو وہ قدرت کی طرف سے لے کر آیا ہے۔لیکن جس وقت وہ قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے، قاعدے کے خلاف معاملہ کرتا ہے،غبن کرتا ہے، خیانت کرتا ہے، جھوٹ بولتا ہے، بددیانتی کرتا ہے، اس وقت ہم اس کا محاسبہ کرتے ہیں کیونکہ یہ اختیار کی چیز ہے۔انسان اگر اپنے دل سے پوچھے تو دل ٹھیک فتویٰ دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ کہاں وہ مجبور ہے اور کہاں مختار ہے۔

خواب اور وحی

سوال: خواب کووحی کی ایک شکل جانا جاتا ہے،لیکن ماہر نفسیات کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ انسان کے لاشعور کی وجہ سے ہوتا ہے،اس صورت حال میں وحی کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟

جواب: خواب اللہ تعالیٰ کی ہدایت کا ایک ذریعہ ہے۔خوابوں کے بارے میں دور جدید میں بہت کام ہوا ہے۔فرائڈ کے زمانے سے خوابوں کے مطالعے کی ایک سائنٹیفک دنیا وجود میں آئی ہے، اس کے اوپر مزید بہت سا کام ہوگیا ہے اور بہت سے پرانے تصورات بھی ختم ہوئے ہیں۔قرآن مجید نے بھی اس مسئلے کوموضوع بنایا، مگر اس طرح سے نہیں جس طرح سے وہ توحید یا رسالت کوموضوع بناتا ہے۔ضمناً یہ چیز موضوع بن گئی ہے۔قرآن مجید نے اس میں ہمیں یہ بتایا کہ خوابوں کی کئی صورتیں ہوتی ہیں۔اوراب ماہرین بھی اس کوتسلیم کرتے ہیں۔خواب بسا اوقات آپ کے جسم پر گزرنے والی واردات کوممثل کردیتے ہیں۔آپ کے لاشعور کے احساسات کوآپ کے سامنے لے آتے ہیں۔کبھی آپ اپنے دل کے اندر کوئی خصوصی خیال لے کر سو جائیں، وہ بھی خواب کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔آپ کے احساسات تمثیل کی صورت اختیار کرلیتے ہیں۔آپ کا نفس آپ سے باتیں کرنا شروع کردیتا ہے، اسی لیے خواب کوحدیث نفس کہا جاتا ہے یعنی انسان کی جو اندرونی شخصیت ہے، وہ سامنے آجاتی ہے۔

چونکہ انسان کے اندر یہ ذریعہ (medium) موجود ہے تو بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ سو جاتا ہے تو اس کے نفس کے ساتھ گفتگو کرنی آسان ہوجاتی ہے اور ایک تمثیل کی صورت بن جاتی ہے۔اس medium کو شیطان بھی استعمال کرتا ہے۔اوراسی طریقے سے اس کورحمان بھی استعمال کرتا ہے۔مثال کے طور پر سیدنا یوسف کا

خواب قرآن میں بیان ہوا ہے۔ انھوں نے اپنے سامنے گیارہ ستاروں کو اور سورج اور چاند کو جھکتے ہوئے دیکھا۔ یہاں ایک چیز کو ممثل کر کے دکھا دیا گیا۔ حقیقت کئی برس بعد سامنے آئی جب انھوں نے دیکھا کہ ان کے بھائی اور ان کے والدین ان کی تعظیم کے لیے ان کے سامنے جھک گئے۔ یہ وحی کا ایک معاملہ تھا۔

آپ کانوں کے ذریعے سے آوازوں کو سنتے ہیں۔ وہ آواز آپ کی بھی ہو سکتی ہے، میری بھی ہو سکتی ہے، ٹیلی ویژن کی بھی ہو سکتی ہے، ہوا کی بھی ہو سکتی ہے۔ جس طرح آپ کو کان کے ذریعے سے سننے کی ایک صلاحیت دی گئی ہے۔ اسی طریقے سے خواب بھی آپ سے بات کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ آپ خود بھی اس ذریعے سے اپنے آپ سے بات کرتے ہیں اور خارج کی بعض چیزیں بھی آپ سے بات کر سکتی ہیں۔ ان میں بعض اوقات شیاطین کرتے ہیں اور بعض اوقات اللہ تعالیٰ بھی اس کو ذریعہ بنا لیتے ہیں۔

وحی اور عقل

سوال: وحی جو بعض اوقات خواب کی صورت میں آتی ہے، اس کا عقل سے کیا تعلق ہے؟

جواب: انسانی شخصیت کا اگر تجزیہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے پاس جذبات ہیں، خواہشات ہیں، رغبات ہیں، تعصّبات ہیں۔ ہمارے اندر ایک بڑی قوی حس جمالیات ہے۔ ایک اخلاقی شعور ہے۔ یہ چیزیں ایک طوفان کی طرح اُمڈ کے آتی رہتی ہیں۔ وہ چیز جو ان کے اندر تجزیہ کر کے نظم پیدا کرتی ہے اور ان کو معنویت اور مفہوم دیتی ہے، اس کو آپ عقل کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی انسان کا اصلی شرف ہے۔ حواس، وجدان یا تاریخی معلومات کے ذریعے سے جو خبر بھی اس کو پہنچتی ہے، یہ اس کا جائزہ لے کر اور اس کے بعد جو بھی اس کے نتائج ہوں گے، ان کو نظم کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ دے گی۔ انسان کا اصلی کمال یہی ہے کہ وہ اپنے شعور کا بھی شعور رکھتا ہے اور پھر اس شعور کا تجزیہ کر کے، اس سے نتائج نکال لیتا ہے۔ تہذیب و تمدن اصل میں اسی سے پیدا ہوئے ہیں۔ انسان جانوروں کی طرح صرف جبلتوں کا غلام نہیں ہے۔ جانور بھی ہم سے پہلے دنیا میں موجود تھے۔ وہ کوئی تہذیب پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ لیکن ہم میں عقل ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب وحی آئے گی، دین آئے گا تو وہ بھی اسی عقل کے سامنے اپنے آپ کو پیش کرے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دین عقل کے تابع ہے۔ بات دین کو سمجھنے کی ہے۔ یعنی آپ کو حواس کے ذریعے سے جو معلومات پہنچتی ہیں، ان کو عقل ہی سمجھتی ہے۔ اگر عقل نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ایک انسان بھلا چنگا انسان ہوتا ہے، اس کے اعضا میں کوئی خرابی نہیں ہوتی۔

ہر لحاظ سے بالکل درست ہوتا ہے، لیکن دماغی توازن خراب ہو جاتا ہے۔ باقی ہر چیز اسی طرح رہتی ہے۔ خواہشات، جذبات، جبلتیں اپنا کام کر رہی ہوتی ہیں، بھوک لگ رہی ہوتی ہے، جنسی جذبات بھی موجود ہوتے ہیں، لیکن جب عقل ختم ہو جاتی ہے تو نہ وہ دین کا مخاطب رہتا ہے، نہ قانون کا۔ اس وقت انسان کے ساتھ مکالمے کا معاملہ نہیں کیا جاتا، بلکہ ہمدردی کا معاملہ کیا جاتا ہے۔ میرے پاس بحیثیت انسان جو چیز فیصلہ کرنے کے لیے ہے، وہ عقل ہے۔ اسی وجہ سے قرآن بار بار جب اپنی دعوت دیتا ہے تو کہتا ہے 'أَفَلاَ تَعْقِلُونَ (البقرہ ۲:۴۴)' تم عقل سے کام کیوں نہیں لیتے؟ اس لیے عقل اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ سب سے بڑی نعمت ہے۔

مذہب اور اہل مغرب

سوال: اہل مغرب کے ہاں مذہب تقریباً ختم ہو گیا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خدا کا اب پوری کائنات میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اس کے باوجود ان کے ہاں ایک بے مثال نظام ہے، احتساب (Accountability) ہے۔ وہ لوگ ذمہ داریاں پوری کرتے ہیں اور جو اہل مذہب ہیں، خدا کا نام لیتے ہیں، بالخصوص مسلمان تو ان کی حالت تو ابتر ہے۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: دراصل اس بارے میں ایک غلط مقدمہ قائم کر لیا گیا ہے۔ وہ مقدمہ یہ ہے کہ مذہب ہماری دنیوی زندگی کی کامیابی کے لیے آیا ہے۔ جبکہ یہ بات مذہب کا موضوع ہی نہیں ہے۔ انسان اگر دنیا میں ترقی پانا چاہتا ہے تو اس کے لیے اس کو علم حاصل کرنا ہے، اپنی طبعی زندگی کا مطالعہ کرنا ہے، اپنے اخلاقی وجود کو بہتر بنانا ہے، اپنے اندر آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کرنا ہے۔ اگر وہ علم کے میدان میں آگے قدم بڑھاتا ہے اور مادے کو توانائی میں بدلنے کی کوئی نئی صورت دریافت کر لیتا ہے تو وہ آگے بڑھے گا، اس کو روکا نہیں جا سکتا۔ یہ ہیں وہ چیزیں جن پر قوموں کی ترقی کی بنیاد ہوتی ہے۔ یہ مغرب کر لے یا مشرق کر لے، یکساں نتائج نکلیں گے۔

دنیا کی زندگی کے اندر تین چیزیں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ ایک چیز آپ کے مادی وسائل ہیں، دوسرے آپ کا علم ہے، تیسرے آپ کی اخلاقی شخصیت ہے۔ مذہب کا موضوع آپ کی اخلاقی شخصیت ہے یعنی اس معاملے میں وہ اثر انداز ہوگا۔ آپ جو اخلاقیات اہل مغرب کے ہاں پاتے ہیں یہ دراصل سیدنا مسیح علیہ السلام کا اعجاز ہے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کا اخلاقی وجود مغرب کے ریشے ریشے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ اس کو نکالا ہی نہیں جا سکتا۔ اس کو آپ نام دیں، نہ دیں، وہ ان کی شخصیت، ان کی نفسیات کا حصہ بن گیا ہوا ہے۔ یہ ہمدردی، محبت، انسانوں کے

معاملے میں حساسیت، یہاں تک کہ جانوروں تک کے معاملے میں حساسیت اور ان کے حقوق کی پاس داری، یہ ساری کی ساری تعلیم درحقیقت سیدنا مسیح کی دی ہوئی تعلیم ہے۔ لیکن بعض اوقات جب انسان کے اندر ایک خاص طرح کا انحراف پیدا ہوتا ہے تو اس کے پاس جو کچھ ہوتا ہے، اس کے معاملے میں وہ دینے والوں کے لیے بھی ناشکری کا رویہ اختیار کر لیتا ہے۔

اس کے بعد بڑا مسئلہ موت کا ہے۔ اور یہ مسئلہ مغرب میں ختم نہیں ہوا، بلکہ آج بھی پوری قوت کے ساتھ موجود ہے۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ مثال کے طور پر بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ آپ انھیں بتائیں کہ کھانے پینے میں احتیاط کرو، ورنہ تمھیں کوئی بیماری لاحق ہوسکتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نہیں، اس وقت کی زندگی گزارنے دو 'بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست' (یعنی اے بابر عیش وعشرت میں زندگی بسر کرو یہ دنیا دوبارہ نہیں حاصل ہوگی)، جب بیماری آئے گی، دیکھا جائے گا۔ اس طرح کے بے شمار لوگ ہوتے ہیں۔ مغرب بھی بحیثیت مجموعی مذہب کے ساتھ دراصل یہی معاملہ کر رہا ہے۔ وہاں موت کے مسئلے کو کچھ دیر کے لیے نظر انداز کر دیا گیا ہے، لیکن یہ اپنی پوری طاقت سے نمودار ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہاں ہر شخص نے یہ فیصلہ کر لیا ہے۔ مغرب میں اس وقت بھی آپ کو ایسے کروڑوں لوگ ملیں گے جو غیر معمولی مذہبی وابستگی رکھتے ہیں۔ مذہب کے معاملے میں بڑے حساس ہیں۔ ان کے ہاں جو مذہبی روایت تھی، اس کے ساتھ دو آفات لاحق تھیں۔ ایک یہ کہ مذہب کے عقائد بدقسمتی سے صوفیانہ مظاہر کے زیر اثر بائبل سے بہت دور ہو چکے تھے۔ اس کو ہر عاقل نے رد کرنا ہی تھا، وہ رد ہو گئے۔ دوسری یہ کہ ان کے ہاں مذہب ایک Institution (ادارے) میں تبدیل ہو گیا تھا اور وہ پوپ کا Institution تھا۔ اس کو ایک سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ اس سے کچھ مفاسد پیدا ہوئے اور انھوں نے اس کے خلاف بغاوت پیدا کی۔ لہٰذا مغرب کے معاملے کو اس طرح دیکھنا چاہیے۔

مذہب اور تشدد

سوال: مذہب پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ یہ نفرت پیدا کرتا ہے۔ مذہبی لڑائیاں بہت ہوتی ہیں، انتہا پسندی مذہب سے پیدا ہوتی ہے، لوگ مذہب کے معاملے میں دوسروں پر تشدد کرتے ہیں۔ کیا مذہب فی الواقع اس کا ذمہ دار ہے؟

جواب: مذہب تو یقیناً اس کا ذمہ دار نہیں ہے۔ اصل میں تو انسان کی خواہشات اور اس کے تعصّبات یہ کام

کرتے ہیں۔ انسان کے اندر چونکہ انحراف کی بڑی غیر معمولی صلاحیت ہے، جس وجہ سے وہ بعض اوقات مذہب جیسی مقدس اور پاکیزہ چیز کو اس کے لیے استعمال کر لیتا ہے۔ جو چیز بھی اثر انگیز ہوگی اور انسانی شخصیت پر جس کی گرفت ہوگی، اس کو استعمال کر لیا جائے گا۔ چنانچہ ان نفرتوں کے لیے انسان نے قومی تعصّبات کو بھی استعمال کیا ہے، انسان نے اپنے آدرشوں اور نصب العین کو بھی استعمال کیا ہے۔ پچھلی صدی کی ابتدا میں انسان نے یہ تصور دیا کہ ہم انسانوں کی بہتری کے لیے ایک ایسا نظام بنانا چاہتے ہیں، جس میں ملکیت کے ذرائع ختم کر دیے جائیں۔ اس میں لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ غریبوں کے مسئلے کو حل ہونا چاہیے، یہ بات تو بڑی اچھی ہے لیکن اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے آپ نے ایک نظام کا تصور قائم کیا اور پھر اس کو قائم کرنے کے لیے آپ تلوار لے کر کھڑے ہو گئے۔ یہ ایک صحیح چیز کا غلط استعمال ہے۔ وہ مذہب کا بھی ہو جاتا ہے۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ کیا ہم نے مذہب کے معاملے میں لوگوں کو educate کیا ہے؟ یقیناً نہیں کیا۔ اگر کیا ہوتا تو اس طرح کے مسائل کبھی جنم نہ لیتے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو اس بات کا بڑا غیر معمولی اہتمام کیا ہے کہ لوگ مذہب کو غلط استعمال نہ کر سکیں۔ لیکن ہم نے اس اہتمام سے فائدہ ہی نہیں اٹھایا۔ اس لیے کہ آپ جتنا جی چاہیں اہتمام کر لیں، اعلیٰ سے اعلیٰ علم لوگوں کے سامنے رکھ دیں، اگر آپ نے لوگوں تک اس کو پہنچانے کا اہتمام نہیں کیا تو اس کے نتیجے میں کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ طب کی اعلیٰ سے اعلیٰ کتابیں لکھ کے دے دیجیے اور ان کو لائبریری میں رکھ دیجیے، اگر آپ نے اپنی قوم کو educate کر کے اچھے ڈاکٹر پیدا کرنے کا اہتمام نہیں کیا تو عطائی راج کریں گے اور وہ لوگوں کی زندگی سے کھیلیں گے۔ یہی صورت حال مذہب میں ہے۔